
آسماں محراب
شمس الرحمٰن فاروقی
HaSnain Sialvi

آسماں محراب

HaSnain Sialvi

آسماں محراب

شمس الرحمٰن فاروقی

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

آسماں محراب (چوتھا مجموعۂ کلام)

۱۹۷۶ سے ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب

مصنف : شمس الرحمٰن فاروقی

خطاط : کفیل احمد قاسمی

سرورق : آصف جمیل، عادل منصوری

مطبع : کراؤن آفسٹ پریس، الہ آباد

ناشر : شب خون کتاب گھر

۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

اشاعت اول ۱۹۹۶

قیمت : دو سو دس روپے ۲۱۰/- Rs. 210/-

Āsmān Mihrāb (Poems)
by Shamsur Rahman Faruqi (b. 1935)
First published : 1996
ISBN

For Suraj, who cannot read.

My heart rouses
    thinking to bring you news of something
that concerns you
    and concerns many men. Look at
        what passes for the new.
You will not find it there but in
            despised poems.
        It is difficult
to get the news from poems
        yet men die every day
            for lack
of what is found there.

William Carlos Williams

Novels and essays serve but will not last. One clear stanza can take more weight than a whole of elaborate prose.

Czeslaw Milosz

Poems should be written rarely and reluctantly, under unbearable duress and only with the hope that good spirits, not evil ones, choose us for their instrument.

Czeslaw Milosz

آسمان محراب

شمس الرحمن فاروقی

ہمہ قبیلۂ من عالمان دیں بودند
مرا معلم عشق تو شاعری آموخت

(سعدی)



دیباچہ

اس کتاب میں ۱۹۷۶ سے لے کر ۱۹۹۶ تک کے کلام کا انتخاب ہے۔ صرف تین منظومات قبل ۱۹۷۶ کے ہیں۔ کلام کے انتخاب اور ترتیب میں نیر مسعود نے بہت توجہ اور محنت صرف کی۔ کتاب کا عنوان بھی انھیں کا تجویز کردہ ہے۔ ان کی توجہ اور جمیلہ کی یاددہانیوں نے اس مجموعے کو تکمیل تک پہنچایا۔ نیر مسعود نے انتخاب میں کچھ زیادہ دریادلی سے کام لیا تھا۔ لہٰذا میں نے تصرف مصنفانہ کا استعمال کرتے ہوئے کئی نظموں غزلوں کو حذف کر دیا ہے۔ نیر مسعود کے علاوہ جن دوستوں کو میری شاعری کے بارے میں خوش گمانی رہی ہے ان میں مرحوم کیسری کشور، مرحوم زیب غوری، بلراج کومل، شہریار اور عرفان صدیقی کے نام سر فہرست ہیں۔ میں ان کا شکر گذار رہوں گا۔ برادران عزیز محمد یعقوب فاروقی اور محبوب الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب کو منظر عام پر لانے کی مہم میں ہر ممکن تعاون دیا۔ میاں محبوب الرحمٰن فاروقی اور احمد محفوظ نے کتابت اور تصحیح کے تمام مراحل پر دل وجان سے محنت کی۔ مولانا کفیل احمد قاسمی کی خطاطی نے کتاب کو چمکا دیا۔ عادل منصوری نے کتاب کے نام اور میرے نام کے نقش بنائے اور آصف جمیل نے سرورق بنایا۔ احمد محفوظ اور میاں نور الرحمٰن فاروقی نے آخری پروف پڑھے۔ میں ان سب کے احسان سے گراں بار ہوں۔

بعض لوگ کہتے ہیں میری شاعری کا رنگ ادھر کچھ بدلا ہے۔ گزشتہ تقریباً دو دہائیوں کے اس خرمن خاکستری کو یک جا دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ اگرچہ مجھ پر اتباع میر کا الزام نہیں لگ سکتا، لیکن یہی اٹھارہ بیس برس میں نے میر کی غزل کو بھی سمجھنے کی کوشش میں صرف کئے ہیں ؎

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

الٰہ آباد
۱۷ اپریل ۱۹۹۶

شمس الرحمٰن فاروقی

HaSnain Sialvi

فہرست

آسمان محراب، شمس الرحمن فاروقی

نامکمل سوانح حیات

باب اول

خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں پچاس سال سے میں
اگر وہ ہے تو اسے میں نے پا لیا ہوتا۔
یہ ہارڈی نے کہا تھا

بچارہ ہارڈی، وہ
اسیر دام تعقل قتیل منطق و فکر
اسے خبر نہ تھی بازار کا ہے رنگ ہی اور
سجی ہوئی یہ دکانیں نمائشی ہیں فقط
گرہ میں دام یہاں ہوں تو کچھ نہیں ملتا
وہ سکہ عقل ہے جس کا نہیں کوئی خواہاں
دکان پر جو ملے مال بے حقیقت ہے
جو ڈھونڈنے سے ملے وہ خدا نہیں ہوتا

جو سوچنے سے کھلے وہ کلی نہیں ہوتی۔
فلسفی کو موشگافی سے خدا ملتا نہیں
ناخن مشاطہ کو سررشتۂ گیسو کبھی
شانہ آسا آپ اپنے سے جدا ملتا نہیں
تار کو سلجھا رہی ہے اور سرا ملتا نہیں۔

میں فلسفی تو نہیں ہوں (یہ ہارڈی کہتا)
میں راہ معرفت حق کا ایک سالک ہوں
نحیف سالک درماندہ، حال و ماضی کا۔
ہر ایک ملک کا مسافر، میں ہر زمانے میں
جلائے قلب و تجلی داغ سوزاں کا
رہین ورفتہ و دل خستہ و شہید رہا۔
(کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل)
اگر وہ حق ہے تو آئے سفینہ غرق کرے
کہ ختم ہو شب تاریک و بیم موج کی بات
محیط دل پہ ہوئے کیفیت کا نظم و سکوں
ہر اک شکستہ کڑی خود کو جوڑے آپ سے آپ

تمام بکھرے ہوئے لفظ مل کے شعر بنیں۔

لسان گنگ سبک گردد و غبار و رماد
بر افتد از سر اوراق نانوشتہ، و باد
وزد ز خلد، کند زندہ کشت بے آبے
کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسد۔
چو پردہ از دل محجوب برکشد برقے
نہفتہ صورت معنیش بے نقاب رود۔

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا
حسنک نور النظر نورک فوق الثنا
حسن ترا ہے اگر نور نگاہ بشر
پھر تو اس آفاق میں کوئی بھی باطل نہیں
تیرے مرے درمیاں پھر کوئی حائل نہیں
قلب سیہ پر مگر کیوں تو نہیں جلوہ گر؟
نور سماوات و ارض، تجھ سے مجھے کیا ملا
فیضی بے چارہ تھا منتظر حرف راز

(امروز نہ شاعرم حکیمم
دانندۂ حادث و قدیمم)

حکمت ماضی و حال اس کے لئے ہو گئی
حرف کی صنعت گری، مثنوی نل دمن
حرف تو موجود ہے. نظم کا سلک گہر
آئینۂ حرف و صوت
آئینہ حکمت کہاں
آئینہ حس و گماں ذات کا زندانی ہے۔

میں ایک شاعر بے چارہ تاجر الفاظ
کہیں ہوں ہارڈی، بیدل کہیں، کہیں حافظ
لیئر کا ہیملٹ و جولیٹ کا صورت گر
یہ کہہ گیا ہے کہ شاعر کی آنکھ
فیض جنوں سے گرم
جب سر افلاک سے گزرتی ہے
زمیں کی گم شدہ گہرائیوں کو چھوتی ہے

کہ بے وجود کو بھی بخشتی ہے نام و مقام
تو کیا یوں ہی شعرا نے صنم تراشے ہیں ؟
تو کیا تجھے کہوں اپنے وجود کا پرتو ؟
مگر وجود تو میرا نہیں ترا ہی ہے
کہ بو علی مجھے ممکن بتاتا ہے، واجب
تجھے وہ کہتا ہے۔ میں کچھ نہیں
فقط ممکن ہوں میں
نہ ہوتا اگر یا اگر میں ہوں تو بھی
کسی کو کیا مرے ہونے سے کچھ بھی حاصل ہے ؟
(ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے)
ترے بغیر نہیں میں اگر میں ہوتا بھی . . .

حواشی

مصرع ۱ – ۲ I have been looking for God these fifty years
and I would have found him had he existed.
Thomas Hardy

مصرع ۱۳ مصرع ۱۶ فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
اکبر الٰہ آبادی

مصرع ۲۳ یہ مصرع فیض کا ہے۔

مصرع ۲۸ – ۳۳ مصرع ۳۲ کے سوا، جو سعدی سے مستعار ہے، باقی سب مصرعے میرے ہیں۔

مصرع ۳۵-۳۶ یہ شعر فیضی کا ہے۔

مصرع ۴۳ – ۴۴ یہ شعر بھی فیضی کا ہے (مثنوی "نل دمن")۔

مصرع ۴۶ مثنوی "نل دمن" از فیضی۔

مصرع ۵۳ لیئر، ہیملٹ اور جولیٹ کا صورت گر، یعنی شیکسپیئر۔

مصرع ۵۴-۵۸

The poet's eye in a fine frenzy rolling
Doth glance from heaven to earth, from earth to heaven,
And, as imagination bodies forth
The forms of things unknown, the poet's pen
Turns them to shapes, and gives to airy nothing
A local habitation and a name.

A Midsummer Night's Dream V, I, 12-17.

مصرع ۶۲ بوعلی = شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا۔

مصرع ۶۷ یہ مصرع غالب کا ہے۔

باب دوم

خدا کو ڈھونڈتے مجھے پچاس سے زیادہ سال ہو گئے
(خدا مری تلاش میں ہے یا کہ میں
خدا کو ڈھونڈتا ہوں ہر طرف ؟)
(بے ہودہ چرا در پئے ادمی گردی
بنشین اگر خداست خود می آید)
نہیں، میں اتنا بھاری خطرہ مول لوں، نہیں، نہیں
میں اس کو خود ہی ڈھونڈنے چلوں — چلا ہی ہوں
میں ہر طرف — تمام عمر ہی مری اسی تگاپوے
تلاش و سعی کا فسانہ ہے - میں اب بھی وہم کی
خرد کی ہوش کی گمان کی
تفکر و تشکک و تامل و تجسس و امید و بیم کی

توقعات وانتظار کی تمام وادیوں کو چھان کر
تمام وادیوں کی خاک چھان کر
یہاں تک آیا ہوں جہاں
کہ سرمد شہید میرے ساتھ
چالبازیوں دو رنگیوں کا کھیل
کھیلتا ہے۔ وہ ابھی ابھی تو کہہ رہا تھا
"بیٹھ جا۔ خدا ہے گر تو خود ہی آئے گا"
اور اب عجیب زہر خند برتری کے لہجے میں
یہ کہہ رہا ہے (بلکہ دل میں گونجتا ہے) سن :

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

شہید کے تو ایک معنی ہیں، وہ جو خدا کی راہ میں مرے
اور ایک معنی ہیں، وہ جو گواہ ہو
وہ شخص دونوں معنی میں شہید تھا ــــ
سرور سرمدی کا جرعہ نوش

جھوٹ کیوں کہ بولتا ؟ تو میں بس انتظار کا چراغ
لے کے بیٹھ جاؤں، چپ رہوں ؟ کہ نالہ و فغاں کروں ؟
اسے پکاروں میں جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند ؟
(تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے ست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند)

میں ساری عمر جاگنے کے خواب دیکھتا رہا ـــــ
میں خواب دیکھتا رہا کہ جاگ اٹھا ہوں میں
میں خواب دیکھتا رہا کہ جاگ اٹھوں گا میں

میں سوچتا تھا، زندگی تو خواب ہے ـــــ
فسانہ غفلتوں کا بے خیالیوں کا کورفہمیوں کا بے بصیرتی کا
دل کی مردنی کا روح کے جمود کا۔
مرا خیال تھا کہ جاگ اٹھا ہوں میں، تبھی تو مجھ پہ راز کھل گیا ہے
زندگی کی بے حقیقتی کا، خواب کورچشم کا۔
مگر میں اب یہ سوچتا ہوں، راز کھلنے کا گماں بھی خواب تھا۔
مجھے دراصل کچھ دکھائی دے نہیں رہا تھا، صرف وہم

تھا مجھے۔ میں اب یہ سوچتا ہوں نیند سے اٹھوں گا میں
ضرور اٹھوں گا میں۔
کہ پھر تو زندگی کے جھوٹے وہم سب غلط عقیدے تارِ عنکبوت کی طرح
نسیمِ حق کے سامنے اڑیں گے۔ بود ان کی پھر
نہ بود میں بدل کے میں
نہ بود، بود، یا نمود، سے بلند ہو کے دیکھ لوں گا
کائنات کو۔ دماغ و دل کے بیچ، بچوں کی شگوفہ مسکراہٹیں،
جمال و ناز، موت میں حیات، سب
مثالِ آئینہ کھلیں گے مجھ پہ بابِ خلد کی طرح۔

مگر یہ میرا جاگنے کا جو ارادہ ہے یہ بھی
تو خواب ہے، کہ خواب ہی میں ہوں ابھی تو میں۔ ابھی
تو خواب اور خیال، واقعہ، ہی مجھ پہ حاوی ہیں —
مگر یہ میں نے کیا کہا؟ یہ لفظ واقعہ، یہ میرے دل
میں ٹھنڈی سوئی سی چبھوتا ہے، کہ واقعہ تو موت ہے!

(مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک
بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں)

(بیچ میں یہ واقعہ ہائل ہے میاں
زندگی اک واقعہ ہائل ہے میاں)

سیاہ فام یہ پرند زاغ نحس
مجھ سے کہہ رہا ہے کیا؟ یہ اس کے بازوے طویل وتار
(بال زاغاں را بہ گورستاں برد)
میرے ذہن پر، مرے شعور پر ہیں بادزن
یہ باد زہر اٹھا کے مجھ کو پھینک دے گی
کون سے کنوئیں میں، ہاویہ میں یا کہ ویل میں؟
یہ زاغ دیو ہے؟ جو نوع جن وانس کے ضمیر میں
سفید دیو بن کے جاگزیں ہے، دیو جہل کا۔ تشدد و بہیمیت
کا؟ اژدہا جسے امیر حمزہ صاحب طلسم ولوح بھی نہ مار پائیں گے؟
سنو اس اژدہے کی خود سے گفتگو:

کون امید سے بڑھ کر طاقت ور ہے؟ موت
کون ارادے سے بڑھ کر طاقت ور ہے؟ موت
عشق سے کون ہے جو بڑھ کر طاقت ور ہے؟ موت
کون حیات سے بڑھ کر طاقت ور ہے؟ موت

لیکن کون ہے وہ جو موت سے بڑھ کر طاقت ور ہے؟

ظاہر ہے، میں۔

تو میں جو نیند میں ہی جاگنے کا خواب دیکھتا رہا
کہ جاگنے میں جاگنے کا خواب دیکھتا رہا۔ کہیں
نہ میں نے زاغ اور سایۂ ہما کو ایک جان کر
اسی کو حبل رشد اور دست بیعت و نجات مان کر
اسی کو دل میں رکھ لیا ہو لوح کی طرح؟
تو پھر تو میں، یہ سادہ لوح روستائی،
دن دہاڑے لٹ گیا۔

حواشی

مصرع ۴-۵ یہ مصرعے سرمد کی رباعی کے ہیں۔

مصرع ۲۱-۲۴ یہ بھی رباعی سرمد کی ہے۔

مصرع ۳۱ قرآن پاک، آیت الکرسی۔

مصرع ۳۲-۳۳ یہ شعر اقبال کا ہے۔

مصرع ۵۸-۵۹ یہ شعر میر کا ہے۔

مصرع ۶۴ یہ مصرع مولانا روم کا ہے۔

مصرع ۷۲-۷۷ یہ ٹیڈ ہیوز Ted Hughes کی نظم:

Crow : from the life and songs of the Crow

کے ایک اقتباس کا ترجمہ ہے۔ ہیوز کی نظم میں کوا انسان کے تجربات، اور انسانی اعمال وافکار کے آئینے کا کام کرتا ہے۔ نظم کے جس حصے کا اقتباس میں نے یہاں پیش کیا ہے، اس میں کوا انسان کی تشدد پسندی، جہل پسندی اور تخریبی جبلت کی علامت ہے۔

اصل مصرعے حسب ذیل ہیں:

Who is stronger than hope? Death.
Who is stronger than the will? Death.
Stronger than love? Death.
Stronger than life? Death.
But who is stronger than death? Me, evidently.

باب سوم

اداسی

مرے دل میں دریاے مواج سی
اٹھ رہی ہے۔ یہ ایسا سمندر ہے جس میں
کبھی جزر آتا نہیں ہے۔
یہاں مد ہی مد ہے، گونجتا ہے یہ
پنچم میں استاد فیاض خاں کی گرج دار آواز کی طرح۔
لیکن مری جاں میں اب وہ
توانائی باقی نہیں ہے جو آواز کے قہر
سینے میں خون اور دھوئیں کی تب وتاب
اک بے اماں تھرتھری، سنسناہٹ، فشار حواس وتخیل

کو ہنس کھیل جائے، اٹھالے۔

میں جو یہاں اس طرح بے ہوس و بے حواس
جیب میں تنہائی کے نامۂ الفت بھرے
سینکڑوں پیغام عشق ایک سے اک دل فریب
(عادت خورشید گیر فرد و مجرد شدن
چند بہ کردار ماہ خیل و حشم داشتن)
منتظر جلوۂ طور عدم، سرنگوں، بے بصر و بے صدا
ہر شے سے دور ہوں
کون ہوں میں؟ کون ہوں؟
اب تو مجھے ٹھیک سے نام بھی اپنا، پتہ،
اور وطن، ذات پات
کچھ بھی نہیں یاد، لیکن یہ تو ہے، زخمی ہیں
پاؤں، سر، آنکھیں زبان۔
میں تو تنہائی کا سچا معشوق تھا۔ میں تو وہی ہوں، کبھی جو
سب کچھ چھوڑ کر، صرف اپنے ذہن کو راہ نما جان کر

HaSnain Sialvi

گھر سے چلا تھا کہ اب چل کے مسخر کروں راز حیات و وجود —
بارش کے معجزے، دھوپ کا جادو
نئی کھیتیوں پر روشنی
اور ہوا کا جمال۔ سوئی کی بھی نوک سے
چھوٹا اک جاندار، لاکھوں کروڑوں رقیب
لیکن وہ رحم مادر میں پہنچتا ہے محفوظ، کہ تکمیل ہو
مقصد تکوین کی۔
لیکن وہ جوش، وہ قوت، جو قطرے کو ناپید سے
پیدائی بخشتی ہے کیا وہ عشق ہے؟ یا شہوت
ہے؟ اسے ہم سیل آفرینش کا ریلا کہیں
یا یہ فقط اندھے جذبات کی تسکین ہے؟
اور اگر آفرینش کا یہ سب کھیل ہے
کون ہے اس کا تماشائی پھر؟ ہم اگر
اس کے کردار ہیں، مالک اس کھیل کا کون،
مصنف ہے کون؟ اور اسے
فائدہ اس سے ہے کیا؟ اس میں کیا
کچھ استحصال کی بو نہیں؟ یا جور کا

شائبہ بھی کچھ نہیں ؟

میں اس مسئلے کو نہ حل کر سکا۔ میں فقط
سوچتا ہی رہا۔
حرص میں، اور ہوا میں
(اے رفیقاں زیں مقیل وزاں مقال
اتقوا ان الھویٰ حیض الرجال)
کھپا دینے میں جان کو عشق کے نام پر، فرق کیا ہے ؟

(لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا)

بزرگوں کا کہنا ہے یہ عشق بھی شان ہے
مردمی کی۔ رجل ساز قوت
جو انسان رکھتا ہے عاشق وہی ہے۔
(تو کیا پھر عقیموں کو تاب محبت نہیں ہے؟)

کروڑوں زمیں کے یہ حشرات یہ دام و دد ،
کون سی ہے وہ قوت جو ان کو مسا تا سحر اور
سحر تا مسا پیٹ بھرنے کی کوشش میں ،
جنگ و جدل، سعی تولید میں محو رکھتی ہے ؟
اخلاق کا ضابطہ ان کا کیا ہے ؟
تو کیا عشق سے ان کو بہرہ نہیں ؟
اور میں ؟
میری شان رجولی کا ہے دوسرا نام عشق، اور
یہ عشق ہی جہد ہستی کی بنیاد ہے ؟
(عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم)

بات ہر پھر کے واپس وہیں آگئی
دائرہ عقل کا تنگ ہے، لیکن اتنا نہیں
جو بنائے اسے پھر وہ واپس وہیں آئے گا
(ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں)

اور ٹھہرے تو مشکل، جو بھاگے تو مشکل۔

چو غوغا کند بر دلم نامرادی
من اندر حصار رضا می گریزم

لیکن یہ رضا کیا ہے؟ کس بات پہ راضی ہوں؟
کچھ اصل بھی ہے میری؟ سایہ ہوں کہ ہستی ہوں؟
نیوٹن نے کہا مجھ سے دنیا تو مشینی ہے
کچھ شکلیں ریاضی کی اشکال قلیدس کے
قانون کچھ اشیا کی حرکت کے سکونت کے
بس جان لو ان کو، پھر دنیا ہے اک آئینہ
ہے عکس فگن جس میں وہ روے خداوندی
مبدأ ہے جو معنی کا اسرار کا سرچشمہ
ہر چیز اسی کی ہے، ہر چیز اسی سے ہے

نیوٹن کو کیا پامال اس عہد کی دانش نے،
جس نے یہ کہا

سمجھو، ہر چیز اضافی ہے
ہاں وقت اضافی ہے تم جس کو مکاں
کہتے ہو، وہ بھی اضافی ہے۔
ٹھہراؤ اضافی ہے حرکت بھی اضافی ہے۔

کوئی ایک صدی پہلے اک بچہ معلم سے
کہتا تھا کہ اقلیدس کچھ باتوں کو کہتا ہے
واضح ہیں بذات خود، بنیادی، اصولی ہیں
بالکل متعارف ہیں۔ مانو انھیں بے حجت
تب بڑھ سکو گے آگے۔ اشکال کو ہے حاجت
اثبات و دلائل کی۔ بنیادی مسائل سب
بے بحث ہی ثابت ہیں۔
لیکن یہ ریاضی ہے یا اندھی عقیدت ہے؟
یہ محض توہم ہے۔ منطق کی کسوٹی پر
جو چیز نہ ثابت ہو میں اس کو نہ مانوں گا۔

پھر اپنی جوانی کا بچے نے کیا صرفہ

اثبات ریاضی میں منطق کے دلائل سے
دن رات اسے دھن تھی
منطق سے ریاضی کو ثابت ہی کروں گا میں۔
آخر کو ہوا معلوم
کیا ہندسہ کیا اعداد، موسیقی کے مسائل یا
پیچیدہ ارثماطیق، موہوم ہیں سب کے سب
افلاک میں منطق کے اصل ان کی نہیں گہری
یہ دشت ہے تمثیلی جو مان لو وہ سچ ہے۔
پھر چھوڑی امید اس نے سچ بات کو پانے کی

(ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں)

اکیلا یہاں میں مرا ذہن اور روح کی رات تاریک
کہاں سے انوکھی اداسی یہ اٹھی ہے
جیسے سمندر کی لہریں بلندی سے بہتی ہوں

عریاں سیہ رنگ چٹان پر . . .

جاؤں میں ؟ اب اٹھوں ؟ بھاگ جاؤں ؟
نیاز عطا داشتم تا بہ اکنوں ۱۱۵
نیازم نہ ماند از عطا می گریزم

حواشی

مصرع ۱ – ۳ Yet sadness rises in me like the sea
– Charles Baudelaire

مصرع ۱۵، ۱۶ یہ شعر خاقانی کا ہے۔

مصرع ۴۷، ۴۸ یہ شعر مولانائے روم کا ہے۔

مصرع ۵۰ یہ مصرع میر کا ہے۔

مصرع ۵۱ – ۵۳ }
مصرع ۶۱ – ۶۲ } عشق مجازی کا مادہ رجولیت ہے، اور جب کہ عشق، مجازی سے حقیقت کو پہنچا، پھر رجولیت کی حاجت نہیں۔ اس واسطے اول عشق کو رجولیت درکار ہے اور مشاہدۂ معرفت تشبیہ کو صورت عمرو و بکر ضرور ہے۔

— سید یوسف علی شاہ چشتی نظامی

"شرح یوسفی بر دیوان حافظ" صفحہ ۱۰۹

مصرع ۶۴، ۶۵ یہ شعر اقبال کا ہے۔

مصرع ۶۹، ۷۰ یہ شعر ناسخ کا ہے۔

مصرع ۷۲، ۷۳ یہ شعر بھی خاقانی کا ہے۔

مصرع ۷۶-۸۰ نیوٹن کی سائنس نے ہمیں بتایا کہ کائنات ایک مشین کی طرح ہے جس کی حرکت کو ریاضی کی اشکال کے ذریعہ سمجھنا ممکن ہوگا۔

قلیدس = اقلیدس

مصرع ۸۳-۸۸ اس کے برخلاف آئن سٹائن نے ثابت کیا کہ حرکت اور سکون اضافی ہیں۔ یعنی اضافی سے مطلق کو سمجھنا ممکن نہ ہوگا۔ اور شاید کائنات خود اضافی ہے۔

مصرع ۸۹ تا ۱۰۸ برٹرنڈرسل کو بچپن میں اقلیدس پڑھائی گئی، لیکن اس نے "واضح بالذات" اور "متعارف" اصولوں کو منطقی ثبوت کے بغیر ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے اپنی نوجوانی کا بڑا حصہ ریاضی کی منطقی بنیادوں کو دریافت کرنے کی کوشش میں لگا دیا۔ آخرکار اسے ناکامی ہوئی۔ تفصیلات کے لئے اس کی خود نوشت ملاحظہ ہو۔ "کوئی" بروزن فع۔

واضح بالذات = Self - evident

متعارف (علم متعارف) = Axiom

اَشکال = Theorems

بنیادی مسائل (بنیادی مقدمات) = First Principles

ہندسہ = Geometry

اعداد = Theory of numbers

موسیٰ - محمد موسیٰ الخوارزمی (تقریباً ۷۸۰ تا تقریباً ۸۵۰) مسلمان
ماہر ریاضی و ہیئت جس نے مسائل اعداد پر بڑا کام کیا۔
ریاضی کی مشہور شاخ Algorithm کا نام اسی کے
نام سے مشتق و منسوب ہے۔

ارثماطیق = ارثماطیقی - Arithmetic

مصرع ۱۰۹ یہ مصرع میر کا ہے۔

مصرع ۱۱۰ سینٹ جان آف دی کراس Saint John of the Cross
(۱۵۴۲ تا ۱۵۹۱) کا مشہور اصطلاحی فقرہ ہے:
The dark night of the soul.

مصرع ۱۱۱–۱۱۳ Whence, did you say, does this strange sadness arise
Like tides that over naked black rocks flow?
– Charles Baudelaire

مصرع ۱۱۵، ۱۱۶ یہ شعر بھی خاقانی کا ہے۔ اس قصیدے کا ایک شعر مصرع ۷۲–۷۳
پر نقل ہو چکا ہے۔

قصیدۂ شہر آشوب

قصیدۂ شہر آشوب

در شکوۂ روزگار و معاصران جہالت شعار

من کہ ہم آہنگی مرغ چمن ننگ من است　　دہر ہم دستان ہر زاغ و کلاغم می کند

(میرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ)

ہیں ہم کبوتر بے پر مجادلہ نہ کریں
نہ شور صورت عصفور ہرزہ چانہ کریں
مثال فاختہ ہم بھی ہیں آشتی مذہب
نہیں وہ داب کہ کچھ کام رستمانہ کریں
نہ ہی ہمیں ہے یہ دعویٰ کہ بھول کر خود کو
سخن کے ملک میں سیمرغ سا یگانہ کریں

ہمیں ہے شوق امامت نہ طوع شاگردی
مثال طوطی نو پر سبق پڑھا نہ کریں
ہیں دل شکستہ ابابیل موسم سرما
چلے جو بس تو کبھی رخ سوے ہوا نہ کریں
اگر ہیں نالہ کناں مثل بلبل وطاؤس
تو مدعا یہ نہیں شکوۂ زمانہ کریں
ہے مدعا تو بس اتنا کہ آہوے زخمی
ہیں خون دل سے رقم اک نیا فسانہ کریں

زوال عصر ہے نسر فلک اترتا ہے
صلوٰۃ خوف پڑھیں شتم و بد دعا نہ کریں
عجب گھڑی ہے اسد پر سوار ہو خرچنگ
ہیں ثور و میش خجل قصد سنبلہ نہ کریں
ہے سرنگوں کہیں گڈھے میں گر کے موسیقار
ہوائیں زہر ہے شاہیں یہاں اڑا نہ کریں

اب اژدہے کی کمیں میں لگا ہے راسوے کور
پلنگ و یوز نہ چشمک برابرا نہ کریں
عقاب پنجہ شکستہ ہیں باز بے بازو
چرکوے پدے نہ کیوں دعوے جاہلانہ کریں
پھنسا ہو چوہے کے بل میں جو شیر کا چنگال
تو کیسے چیونٹیاں ہاتھی کا فیصلہ نہ کریں
جو مینڈکی ہو زکامی بہ صد نزاکت و ناز
تو کیوں کلیلیں نہ کچھوے بھی آہوانہ کریں
جو چھپکلی بھی مگرمچھ پہ چھینٹے کسنے لگے
تو تغدری سے ملخ کیوں محاربہ نہ کریں

جو پودنے بھی ہزبرژیاں کے بیٹھے ہیں
بنائیں گھونسلے دعوے مسادیانہ کریں
تو کوزہ پشت ہیں گو کیکڑے بھی سخت مگر
وہ کیوں نہنگ کے بھیجے کا ناشتہ نہ کریں

ہے زد میں افعی کی طاؤس خوش لقا اس دم
چرزک سے چھپتے ڈریں قصد صید کا نہ کریں
جو نخچریں ہیں پیا ہے انھوں نے آب حیات
ہما کے راس پہ خفاش آشیا نہ کریں
ہے فرقِ شیر پہ کانٹوں کا تاج پھر ہم بھی
لحاظ کیوں خریک چشم و گوش کا نہ کریں

ہیں درس گاہیں وہ اصطبل کہنہ جن میں اب
الاغ و اسپ بھی سرگین کے سوا نہ کریں
وہ مثل بوم مسلط ہیں درس گاہوں پر
ہے کون سی حرکت جو اساتذہ نہ کریں
ہے پوچ بافی سوا کام کیا جولاہوں کو
کریں بھی کیا جو عمل عنکبوت سا نہ کریں
تمام اداروں میں قائم شکار گاہ ان کی
غراب و کرگس و کنجشک کا نشانہ کریں
کوئی شکار رہو ہلکا نہیں ہے ان کے لئے
ہو زاغ یا کہ زغن فرق بے حیا نہ کریں

جو آگے پیچھے نہ پھرتا ہو ان کے مثل سگاں
ملازمت یہ اسے شعبے میں عطا نہ کریں
انھیں نہ ذوق تعلم نہ احترام فن
حمق میں طول عنق کیوں ذرافہ سا نہ کریں
خران کودے حماقت یہ ڈگریوں کے غلام
علوفہ خوری بجز کچھ یہ ژاژخا نہ کریں

حکیم فلسفی عالم ہیں بیل کولہو کے
ہے آنکھ بند حقیقت کا سامنا نہ کریں
اساتذہ و متقنن سپاہی فوجی سب
ہیں دشت دہر کے ثعباں اگر ڈسا نہ کریں
تو اپنے دود عفونت سے پوری دنیا کو
شکم حوت کی مانند تیرہ خانہ کریں

ہے حکمرانوں کو جوع البقر کہ قوم کا مال
سمیٹیں ہضم کریں قبضہ غاصبانہ کریں

لہو لہان ہیں آپس میں خونی رشتے دار
سرشت کژدمی خونخواری جارحانہ کریں
گرسنہ گرگ ہوں جیسے ہر اک پہ حملہ کناں
وہی سلوک یہ آپس میں وحشیانہ کریں
یہ عہدہ دار حکومت یہ باز دوختہ چشم
اڑان کا جو کبھی بھولے سے بہانہ کریں ۳۵
پھنسیں وہ دام سیاست میں جیسے پدی بچے
مریں جو حکم امیر و وزیر کا نہ کریں

ہیں نوجوان کہ سڑکوں پہ اینڈتے ہوئے سانڈ
کریں کسی کو اشارے تو سوقیانہ کریں
دماغ ان کا ہے چپٹا مثال بینی خرس
تو ڈگڈگی پہ نہ کیوں رقص وحشیانہ کریں

یہ ملک و قوم کے تاجر یہ اژدران دژم
جو کھینچیں دم تو ہڑپ بے دھڑک زمانہ کریں

ہو کاروبار میں نقصان پھر بھلا کیوں کر
شغال و روبہ اگر شغل تاجرانہ کریں
طبیب یوں کریں تشخیص جیسے ماہی گیر
ندی پہ جائیں مگر فکر جال کا نہ کریں

یہ باغ جہل کے طوطے یہ شاعر و نقاد
نہ بول پائیں تو ٹیں ٹیں ہی جاہلانہ کریں
ہے ٹیڑھی نثر جو سرطاں کی ٹیڑھی چال کی طرح
نہ کیوں یہ نظم کو بھی سخت کج دمانہ کریں
زبان آب سخن سے ہو تر جب ایسوں کی
تو حوت و غوک بھی قوالی صوفیانہ کریں
تخیل بھولے سے گذری نہیں ہے ان کے قریب
یہ نظم کیا کریں بلبل کو گربیانہ کریں
وہ شعر کیا کہیں کوہ سخن کے پربت کاگ
جو کاؤں کاؤں میں کچھ قدر کو کلا نہ کریں
شئے لطیف سے عاری یہ جاہل و شیاد
پڑھیں نہ لکھیں مگر کام قاطرانہ کریں

یہ بحر نظم کے کچھوے یہ مردہ خوار ادب
ملے جو لاشہ برادر کا پھر یہ کیا نہ کریں
کہ جیسے مردوں کو کھاتے ہیں زاغ گنگا میں
یہ نوچیں بوٹیاں دعوت برادرانہ کریں
مکوڑے بیشۂ فن کے یہ پشۂ بے پر
ادب کے شہر پہ آہنگ ناقدانہ کریں
یہ بند بھنگے ہیں گو لر کے بے خبر ان کو
ہوس ہے گفتگو شاہیں سے باغیانہ کریں
یہ سوق علم و ادب کے اجڈ بکر قصاب
ہیں کرتے ذبح چھری کند بسملہ نہ کریں
یہ دشت نثر میں دوڑیں مثال لق لق لنگ
خبر کی ہو نہ خبر فکر مبتدا نہ کریں
نہ کوئی ربط عبارت نہ اصطلاح درست
یہ ماہ و ماہی میں بھی فرق اک ذرا نہ کریں
پہاڑی مینا کے مانند حفظ ہیں فقرے
وہ لفظ یاد نہ آئیں تو ابتدا نہ کریں

ثنا میں خسر و طوطی صفت سے شیریں تر
کریں جو عیب تو فوقی سا ہاجیا نہ کریں
طواف ریڈیو اسٹیشن ان کی خفیہ نماز
یہ سگ پرست ہیں سجدہ کھلا ادا نہ کریں
ملے جو ٹی وی پہ موقع تو سوسمار کی طرح
چپک ہی جائیں نکلنے کا ڈھب ذرا نہ کریں
الف الاغ نہ بے سے یہ بز ہی پہچانیں
شراب عجب پئیں بات شاطرانہ کریں

وزیروں افسروں کے فربہ یہ سگان ادیم
غم عوام میں عوعو سحر شبانہ کریں
بدلتے رنگ ہیں حربا کی طرح یہ شب و روز
ہیں مار مولک بزدل مقابلہ نہ کریں
یہ کرگدن کی طرح بھونڈے کم نگہ بدرو
جو دشمنوں سے بھی امید آب و دانہ کریں
تو دوڑیں مثل شتر مرغ بے مہار یہ خر
ہزار طرح سے پھر دوستی بہانہ کریں

یہ عاملانِ وطن گرگِ دشتِ رشوت کے
شکم دری میں لحاظ اپنوں غیروں کا نہ کریں
مقابلہ ہو کڑے سے تو بھیگی بلی ہیں
پھرے جو پیٹھ دغا بازی عقربا نہ کریں ٦٥

ہیں زخمہ زن کئی شب سے جنابِ فاروقی
بدن کی قمری سے طوقِ نفس جدا نہ کریں
یہ ساری خلق ہے بہری بسانِ مارسیہ
کہو کہ باز رہیں اب لبوں کو وا نہ کریں

حواشی

اردو فارسی میں ایسی نظمیں بہت ہیں جن میں کسی ایک مضمون یا اس کے تلازموں کی تکرار ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں میری سب سے پسندیدہ نظم جرأت کا مخمس شہر آشوب در ہجو نوشاعراں (دراصل ظہور اللہ نوا کی ہجو) ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے ؎

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی
بنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیوں کہ نہ الجھے بہ خانۂ تن جی
ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلچڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

اس نظم کے ہر بند میں چڑیوں کا ذکر ہے اور ان کے متعلق تلازمے ہیں۔ تیئیس بندوں (۱۱۵ مصرعوں) کی نظم میں ۳۴ چڑیوں، گیارہ جانوروں، بائیس پیشوں اور ۲۷ طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔ اس نظم کے حوالے سے ایک مفصل مضمون میں نے نہرو میموریل لائبریری میں ایک سیمنار کے لئے انگریزی میں پیش کیا تھا۔ ساتھ میں نظم کا ترجمہ بھی تھا۔ مضمون

اور ترجمہ سدھیر چندرا کی مرتب کی ہوئی حسب ذیل کتاب میں شامل ہیں :

Social Transformation and Creative Imaginatian
(Allied Publishers, New Delhi)

میں نے اپنی نظم اسی زمانے میں لکھی جب میں سیمینار سے فارغ ہوا تھا، غالباً ۱۹۸۳ کی کوئی تاریخ تھی۔ یہ نظم اپنے زمانے کا شکوہ تو ہے ہی، لیکن یہ جرأت کو، شہر آشوب کو، اور ہجو کی صنف کو خراج عقیدت بھی ہے۔ جرأت کا تتبع کرتے ہوئے میں نے اس شہر آشوب کے ہر شعر میں کم سے کم ایک جانور کا نام لیا ہے۔ نظم میں رعایتیں اور دوسرے تلازمے بھی بہت ہیں۔ ذیل میں چند وضاحتیں درج کرتا ہوں۔

شعر ۱ مصرع دوم عصفور = گوریا۔ ہرزہ چانہ = فضول گو

شعر ۲ مصرع دوم داب = رعب، قوت

شعر ۳ مصرع ثانی سیمرغ = ایک خیالی پرندہ۔ اس کی اصل سی + مرغ بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے "پھول کر" میں ایک لطف ہے۔

شعر ۴ مصرع اولیٰ طوع = رغبت

—— مصرع دوم نوپر = جس کے پر نئے نئے نکلے ہوں۔ طوطے کے نوپر بچوں کو پکڑ کر بولنا سکھاتے ہیں۔

شعر ۵ مصرع اول ابابیلیں موسم سرما میں گرم منطقوں کی طرف پرواز کر جاتی ہیں۔ سردی کے موسم میں اگر کوئی ابابیل نظر آئے تو دل شکستہ ہی ہوگی۔

—— مصرع دوم رخ = ایک خیالی پرندہ بھی ہے۔

شعر ۶ مصرع اولیٰ طاؤس، ایک ساز بھی ہے۔

شعر ۸ مصرع اولیٰ نسر = گدھ، عقاب۔ ستاروں کا ایک جھرمٹ بھی "نسر طائر" کہلاتا ہے۔

—— مصرع ثانی صلوٰۃ خوف، وہ نماز ہے جو خوف جان کے وقت پڑھی جاتی ہے۔
شتم = برا بھلا کہنا

شعر ۹ مصرع اول اسد = شیر۔ خرچنگ = کیکڑا

—— مصرع ثانی ثور = بیل۔ میش = مینڈھا۔ سنبلہ = غلے کی بالی
اسد، خرچنگ، ثور، میش، سنبلہ علم نجوم کے اعتبار سے منازل فلک کے نام ہیں۔ گھڑی اور قصد بھی علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں۔

شعر ۱۰ مصرع اول موسیقار = ایک پرندہ۔ ایک ساز کا بھی نام ہے۔

—— مصرع ثانی شاہیں بھی ایک ساز کا نام ہے، اور پرندہ تو ہے ہی۔

شعر ۱۱ مصرع اولیٰ راسو = نیولا

—— مصرع ثانی بوزنہ = بندر۔ پلنگ = تیندوا، جو بندر کو طرح طرح سے ڈرا کر مارتا ہے۔ اب اس پر یہ زوال اور بندر کو یہ عروج ہے کہ دونوں میں برابر کی چشمک ہے۔

شعر ۱۲ مصرع اولیٰ باز اور بازو میں رعایت ظاہر ہے۔

— مصرع ثانی   چرکوا = ایک بہت چھوٹی چڑیا، اس کی آواز بہت باریک ہوتی ہے۔
پدا، پدی = ایک چھوٹی چڑیا

شعر ۱۵ مصرع اولیٰ   چھپکلی اور مگرمچھ ایک ہی شکل اور خاندان کے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا فرق واضح ہے۔ چھپکلی پانی سے ڈرتی ہے اور مگرمچھ پانی کا جانور ہے، اس اعتبار سے چھپکلی کا مگرمچھ پر چھینٹے کسنا معنی خیز ہے۔

— مصرع دوم   تغدری = Bustard ، ایک بڑا پرندہ جو سانپ، ٹڈی، سب کچھ کھالیتا ہے۔ ملخ = ٹڈی

شعر ۱۶ مصرع اولیٰ   پودنا = ایک چھوٹا پرند جو گھاس میں گھونسلا بناتا ہے۔ ہزبر = شیر ببر۔ ژیاں = تند خو۔ ژیاں کے ایک معنی بچھو بھی ہیں۔

شعر ۱۷ مصرع اولیٰ   کیکڑے کو سخت کوزہ پشت کہنے میں لطف ظاہر ہے۔ نگر (نگرمچھ) ایک جانور بھی ہے۔

شعر ۱۸ مصرع اولیٰ   خوش لقا = خوبصورت۔ لقا ایک طرح کا کبوتر بھی ہوتا ہے۔

— مصرع ثانی   چزک = ساہی، جو اپنے کانٹوں کے باوجود چینٹے کا من بھاتا کھاجا ہے۔

شعر ۱۹ مصرع اولیٰ   یہ مصرع سودا کا ہے۔

— مصرع ثانی   راس = سر۔ خفاش = چمگادڑ

شعر ۲۰ مصرع اولیٰ حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرتے وقت کانٹوں کا تاج پہنایا گیا تھا۔

شعر ۲۱ مصرع ثانی الاغ = خچر، گدھا۔ سرگین = لید

شعر ۲۳ مصرع اولیٰ کہ پوچ بافی ہی ہے کام ان جولاہوں کا (میر)

—— مصرع ثانی عنکبوت = مکڑی

شعر ۲۴ مصرع ثانی غراب = کوا۔ کرگس = گدھ

شعر ۲۷ مصرع ثانی عنق = گردن۔ مشہور ہے کہ لمبی گردن والے لوگ احمق ہوتے ہیں۔

شعر ۲۸ مصرع ثانی علوفہ = گھاس چارہ۔ ژاژ خا = گھاس چبانے والا۔ محاورے میں یاوہ گو۔

شعر ۳۰ مصرع ثانی ثعبان = (بہت بڑا سیاہ رنگ کا) سانپ

شعر ۳۱ مصرع ثانی حوت = مچھلی

شعر ۳۲ مصرع اولیٰ جوع البقر۔ (گائے کی بھوک) ایک بیماری جس میں بھوک بہت لگتی ہے۔

شعر ۳۳ مصرع ثانی کژدم (کج دم) = بچھو۔ حارث = شیر ببر

شعر ۳۵ مصرع اولیٰ بازدوختہ چشم = وہ باز جس کی آنکھیں سی دی گئی ہوں۔ شکاری پرندوں کو سدھانے سے پہلے ان کو قید و بند کا عادی بناتے

ہیں۔ اس غرض سے ان کی آنکھیں سی دی جاتی ہیں۔

شعر ۳۶ مصرع اولیٰ سیاست کے ایک معنی سزا بھی ہیں۔

شعر ۳۸ مصرع اولیٰ بینی - ناک۔ خرس = بھالو۔ دماغ کے ایک معنی ناک بھی ہیں۔

شعر ۳۹ مصرع اولیٰ دژم = بہت بھیانک۔ ایسا جانور جس نے بہت کھالیا ہو۔

شعر ۴۰ مصرع ثانی شغال = گیدڑ۔ شغال اور شغل کا لطف ظاہر ہے۔

شعر ۴۱ مصرع ثانی مگر (= مگرمچھ) ایک جانور بھی ہے۔ ندی کے ساتھ اس کی رعایت ظاہر ہے۔

شعر ۴۳ مصرع اولیٰ سرطان = کیکڑا جو سیدھے کے بجائے دائیں سے بائیں چلتا ہے۔

—— مصرع ثانی کج دم (کژدم) = بچھو

شعر ۴۴ مصرع اولیٰ ذرا سے تغیر کے ساتھ یہ مصرع جرأت کا ہے۔

—— مصرع ثانی غوک = مینڈک

شعر ۴۵ مصرع ثانی بیا = چڑیا جس کا گھونسلا بہت خوب لیکن آواز معمولی ہوتی ہے۔

شعر ۴۶ مصرع اولیٰ پربت کاگ = پہاڑی کوا جسے بعض لوگ منحوس کہتے ہیں۔ انگریزی میں Raven کہلاتا ہے۔

—— مصرع ثانی کوکلا = ایک طرح کی کوئل

شعر ۴۷ مصرع اولیٰ شیاد = مکار، فریبی

—— مصرع ثانی قاطر = خچر، گدھا۔ سعدی کے شعر کی طرف اشارہ ہے۔

(چارپایے بروکتابے چند + نہ محقق بود نہ دانش مند)

شعر ۴۸ کچھوے مردہ خور مشہور ہیں۔ یہاں اور اگلے شعر میں حدیث
نبویؐ کی طرف اشارہ ہے کہ غیبت کرنے والا اپنے بھائی کا
گوشت کھاتا ہے۔

شعر ۴۹ مصرع اولیٰ یہ مصرع ناسخ کا ہے۔

شعر ۵۰ مصرع اولیٰ پشہ = مچھر

—— مصرع ثانی آہنگ = ارادہ، حملہ

شعر ۵۲ مصرع اولیٰ سوق = بازار

—— مصرع ثانی بسملہ = بسم اللہ

شعر ۵۳ مصرع اولیٰ لق لق = سارس

—— مصرع ثانی خبر اور مبتدا جملے کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں۔ مبتدا =
جملے کا پہلا حصہ۔

شعر ۵۴ مصرع ثانی علم نجوم میں ماہ ایک ستارہ ہے اور ماہی ایک برج فلک۔

شعر ۵۶ مصرع اولیٰ خسرو = امیر خسرو جنھیں طوطیٔ ہند کہتے ہیں۔ خسرو (بادشاہ)
اور شیریں کی رعایت ظاہر ہے۔

—— مصرع ثانی فوقی = ایران کا مشہور فحش گو شاعر

شعر ۵۸ مصرع اولیٰ سوسمار = گوہ ۔ چھپکلی کی ذات کا ایک بڑا اور بدصورت جانور جو دیوار وغیرہ سے چپک جائے تو چھڑائے نہیں چھوٹتا۔

شعر ۵۹ مصرع ثانی عجب = غرور

شعر ۶۰ مصرع اولیٰ ادیم = دسترخوان

شعر ۶۱ مصرع اولیٰ حربا = گرگٹ

—— مصرع ثانی مارمولک = چھپکلی ۔ مارمولک اور حربا ایک ہی خاندان کے ہیں ۔

شعر ۶۲ مصرع اولیٰ کرگدن = گینڈا

شعر ۶۳ مصرع اولیٰ شترمرغ کی تیز رفتاری مشہور ہے ۔ شتر اور بے مہار کی رعایت ظاہر ہے ۔

شعر ۶۴ مصرع اولیٰ عامل = حاکم، افسر

—— مصرع ثانی شکم دری = پیٹ پھاڑنا ۔ مشہور ہے کہ بھیڑیا اپنے شکار کا پیٹ فوراً پھاڑ دیتا ہے ۔

شعر ۶۶ مصرع اولیٰ زخمہ زن = محو نغمہ سرائی ۔ (زخمہ ستار کے مضراب کو کہتے ہیں ۔)

—— مصرع ثانی قمری کی گردن پر سیاہ پٹی ہوتی ہے، اسے طوق کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جب تک طوق ہے تب تک قمری بھی ہے ۔ لہٰذا

انسان کا بدن اگر قمری ہے تو سانس اس کا طوق ہے۔

شعر ۷، مصرع اولیٰ بہری ایک پرند کا بھی نام ہے۔ مشہور ہے کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔

—— مصرع ثانی باز بھی ایک پرند ہے۔ "باز رہیں" کے ایک معنی ہیں، "کھلے رہیں"۔ اس اعتبار سے "باز رہیں" اور "دانہ کریں" میں بھی ایک لطف ہے۔

تمام شد شہر آشوب شمسی

ترجمہ

ایک نئی رات کے بارے میں

بی بی، تم، جس کے ساتھ میں جیا ہوں
بی بی، تم، جس کے ساتھ میں جی رہا ہوں
بی بی، تم، جس کے ساتھ میں جیوں گا
ہمیشہ، ویسے کا ویسا

تمھارے جسم پر ایک سرخ لبادہ
سرخ دستانے، سرخ نقاب
اور سیاہ موزے ہونا چاہیئے

جو تمھیں بالکل عریاں دیکھ سکنے کے وجوہ اور ثبوت ہوں
خالص عریانی، اور مزین زیورات

چھاتیاں، ہائے میرا دل

جتنا تم مجھے جانتی ہو
اس سے بہتر مجھے کوئی جان نہیں سکتا

تمھاری آنکھیں، جن میں ہم محوِ خواب ہیں
دونوں کے دونوں،
انھوں نے تمام دنیا کی راتوں کے لیے جیسی
تقدیر بنائی ہے، اس سے بہتر تقدیر مری مردانہ آنکھوں
کے لیے بنائی ہے۔
تمھاری آنکھیں جن میں میں سفر کرتا ہوں
انھوں نے شاہراہوں کے اشاروں کے لئے
وہ معنی پیدا کئے ہیں جو زمین سے بالکل الگ
تھلگ ہیں

تمھاری آنکھوں میں، وہ جو ہماری
لاانتہا ہی تنہائی ہم پر منکشف
کرتے ہیں، اب ویسے نہیں ہیں جیسا
انھوں نے خود کو سمجھا تھا

تمھیں
کوئی بھی اتنا نہیں جان سکتا
جتنا میں۔

فرانسیسی (پال ایلوار) سے ترجمہ

گلِ رنجور

لال گلاب
تو بیمار ہے
وہ نادیدہ بھونرا
جو راتوں میں
غوغا کرتی آندھی میں
اڑتا پھرتا ہے

اس نے تیرے
سرخ عیش کا بستر
پا لیا ہے
اور اس کا تاریک پراسرار عشق
تیری زیست برباد کر رہا ہے

انگریزی (ولیم بلیک) سے ترجمہ

ولے مجنوں نہ خواہد شد[1]

تم سے محبت مجھے تھی اور ممکن ہے
آج بھی ہو. لیکن تم تو بھول ہی جاؤ
اس محبت کو جس کا دباؤ تم پر اس درجہ تھا
آنسو نہیں، بالکل نہیں۔ ہنسو، بس ہنستی رہو

میں نے تمھیں چاہا، چپ چاپ، مایوس
تمھارا چاہنے والا میں سچا، رشک کا مارا

---

[1] شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کاے معشوق بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نہ خواہد شد

(حافظ)

خوف زدہ، میں نے تمھیں چاہا
اللہ اللہ میں نے تمھیں کس طرح اور کتنا چاہا !
اللہ تمھیں کسی دن پھر
کوئی مجھ سا دے دے

روسی (الگزنڈر پشکن، براہ انگریزی) سے ترجمہ

پیری میں بوسۂ لب کا خیال

کچا انگور
تم نے مجھے نہ دیا
پکا رسیلا انگور
اور تم نے مجھے چلتا کیا
اب تم کیا مجھے
سوکھی کشمش پر بھی
دانت نہ تیز کرنے دو گی ؟

گم نام قدیم یونانی شاعر (براہ انگریزی) سے ترجمہ

نظم

درد
کا دخول میرے اندر
قطرہ
قطرہ

یونانی (سیفو براہ انگریزی) سے ترجمہ

اچھا تمھیں تو معلوم ہی ہے

اچھا تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ کہاں
(کچھ دن پہلے کی بات ہے) تم نے
حقیر و ناکارہ گردانا، میری چھوٹی آنکھوں کو
چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، رانوں کو
اور کچھ اور چھوٹے قد کی چیزوں کو
تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ کہاں

یہ تو ٹھیک ہے کہ تمھاری آنکھیں
خوب کالی اور بڑی بڑی ہیں اور ٹانگیں
مخروطی ہیں رانیں للچانے والی ہیں

لیکن جس چیز کی قدر
ہمارے دلوں میں سب سے بڑھ کر ہے
وہ ایک چھوٹی سی چیز ہے
تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ کہاں

انگریزی (الگزنڈر پوپ) سے ترجمہ

نظم

افسوس کہ ادام چلی گئی
اس نے وہی کیا جو
اس کی مرضی تھی
اور سچ تو یہ ہے کہ
کوئی بھی حسینہ ہو، حسینوں کے ساتھ
ہر تعلق
ٹوٹ جاتا ہے گل سڑ جاتا ہے

عربی (بشر ابن ابی حازم اسدی) سے ترجمہ

رائگاں

تم جب آخری بار آئیں
تو پھول لائی تھیں
لال گلاب سفید چنبیلی
خون اور تقدس
اور تم نے انھیں میرے سامنے
بکھیر دیا — ایک تحیر سا تمھاری آنکھوں میں
یہ تمھارے لئے ہیں

ہم دونوں ہی گویا
سناٹے میں آ گئے
اور ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"کیا یہ عشق ہے؟" نہ میں سمجھا
اور نہ تم

اس دن ہم ساتھ رہے، دن بھر
لیکن لمس ہم سے بیگانہ رہا

لیکن یہ دل ہائے میرا دل جو خود کو تڑپاتا ترساتا ہے
ٹوٹ جا کم بخت
اپنی تنہائی سے خود کو چیر کے پھینک

انڈونیشیائی بھاشا (شاعر ل انور براہ انگریزی) سے ترجمہ

چڑیا

تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا کیا؟
میں سن نہیں پایا
وہ بولی میں نے اک
ننھی سی چڑیا دیکھی
کہاں تھی وہ؟
وہ سامنے پیڑ پر
اچھا، اس نے کہا، میں سمجھا
تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا

انگریزی (رابرٹ کریلی) سے ترجمہ

الوداعی تحفہ

بہت ساری چاہت
—— مگر کیوں ایسا لگتا تھا کہ چاہت ہی نہیں ؛
آخری بوتل کا دور، کچھ نہیں
اک مسکراہٹ بھی جگا نہ سکا

شمع کو
بس ذرا خیال و کرم تھا
اسے ہماری جدائی کا غم تھا، وہ ہم پر روتی رہی
تھوڑی دیر میں سویرا آ گیا

چینی (دو مو، براہ انگریزی) سے ترجمہ

عہدِ قدیم

بیدل ہمیں
چارہ ہی جگر سوختگی سے
نہیں کوئی
یاں لالہ صفت
داغ سے اک عہدِ قدیمی
ہے ہمارا

فارسی (میرزا بیدل) سے ترجمہ

شاعر سے بات چیت

تم شاعر ہو ؟
ہاں، بالکل۔

تمھیں کیسے معلوم کہ تم شاعر ہو ؟
میں نے شعر لکھے ہیں۔

اگر تم نے شعر لکھے ہیں تو اس کا مطلب

میروسلاد ہوئب چیکوسلواکیا کا سربرآوردہ جدید شاعر ہے۔ چونکہ وہ انگریزی بخوبی جانتا ہے اس لئے اپنی نظموں کا انگریزی ترجمہ اکثر وہ خود ہی کرتا ہے۔ مندرجہ بالا نظم کا بھی انگریزی ترجمہ خود اس کا کیا ہوا ہے۔ یہ نظم اس نے جنوری ۱۹۸۹ میں منعقد عالمی شاعری میلے (بھوپال) میں سنائی تھی۔ میں بھی اس محفل میں شریک تھا۔

یہ ہے کہ تم شاعر تھے۔ مگر اب ؟
میں پھر کسی دن شعر لکھوں گا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم پھر کسی دن
شاعر ہو گے۔ لیکن تمھیں
یہ کیسے پتہ لگے گا کہ جو تم نے لکھا ہے وہ شعر ہے ؟
میرا یہ شعر بالکل میرے پچھلے اشعار کی طرح
ہو گا۔

تب تو یقیناً وہ شعر نہ ہو گا۔ شعر تو
بس ایک بار ہوتا ہے، دوسری بار پھر
وہ چیز نہیں ہو سکتی۔
مجھے یقین ہے کہ میرا اگلا شعر بھی پچھلے ہی شعر جتنا اچھا ہو گا۔

تمھیں کیسے معلوم ؟ کسی شعر کی خوبی بھی بس ایک
بار ہوتی ہے، اور اس کا بھی انحصار
تم پر نہیں بلکہ حالات پر ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ حالات بھی پہلے ہی جیسے
ہوں گے۔

اگر یہ تمھارا یقین ہے، تو تم شاعر نہ بن سکو گے اور نہ پہلے
ہی کبھی تم شاعر تھے۔ پھر تمھیں کیوں یہ خیال ہے
کہ تم شاعر ہو؟
خیر، مجھے ٹھیک نہیں معلوم،
اور تم کون ہو؟

انگریزی (میروسلاو ہولب) سے ترجمہ

شاعر کی پہچان

شاعر کہاں ہے ؛ مجھے دکھاؤ ، دکھاؤ

شعر و فن کی اے دیویو، تاکہ میں اسے جان سکوں، پہچان سکوں۔

شاعر وہ شخص ہے جو ہر انسان کے برابر ہے۔

چاہے وہ بادشاہ ہو یا قبیلۂ مفلساں کا غریب ترین فرد

یا چاہے اور کوئی بھی عجیب شے ہو، افلاطون اور بوزنہ کے درمیان۔

شاعر وہ شخص ہے جو چڑیوں کی تمام جبلتوں تک پہنچنے کی راہ

ڈھونڈ لیتا ہے، چڑیا چاہے ننھی پدی ہو یا عقاب ہو۔

اس نے شیر ببر کی دہاڑ سنی ہوتی ہے

اور وہ ان تمام باتوں کو بیان کر سکتا ہے

ببر شیر اپنے مردانہ، سنگ نما گلے سے جن کا اظہار کرتا ہے

اور چیتے کی چیخ بھی اس کے لئے بولتی اور لفظوں سے معمور آتی ہے،
اور اس کے کانوں پر یوں اثر انداز ہوتی ہے
گویا مادری زبان ہو۔

انگریزی (جان کیٹس) سے ترجمہ

یک ہزار و نہ صد و نود و چار

کس قدر واہیات ہیں یہ دن رات کہ چرانے کو کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی
ایسا جس سے کچھ چرایا جائے
سارے قشون و جیوش دور دراز کی مہموں سے خالی ہاتھ لوٹ
رہے ہیں
ایک کاہنہ ماضی اور مستقبل کے درمیان گڑبڑا جاتی ہے، گویا وہ
انسان نہ ہو، درخت ہو
اور اداکار، جنھیں اب کوئی واہ واہ نہیں کرتا
وہ ساری سطور بھول جاتے ہیں جو عظمت سے بھرپور تھیں۔ نسیان
بہرحال، ماں ہے
کلاسیک کی۔ بالآخر یہ ماہ و سال بھی
سنگ مرمر کی ایک سِل کی طرح دکھائی دیں گے

جس میں باریک باریک رگوں کا جال ہوگا (آب گذار،
نظام محاصل،
زمین دوز مقابر، تازہ بہ تازہ خبریں، گپ، شپ۔)
اور اس کی درازوں میں سے سر اٹھاتا ہوا گھاس کا گچھا۔
درحالے کہ یہ زمانے افلاس اور اکتاہٹ کے زمانے تھے
جب چرانے کو کچھ نہ تھا اور خریدنے کے لئے اس سے بھی کم
اور کسی کو تحفتاً کچھ پیش کرنے کا تو ذکر ہی کیا؟
اور اس میں حاکم کا بھی کوئی قصور نہیں، بلکہ اسے تو اوروں سے
بھی زیادہ زحمت تھی
کہ سامان عیش نہ تھے۔ اور نہ ہی یہ بجا ہے کہ ہم ستاروں کو
الزام دیں
کیوں کہ افق پر گھنے نیچے بادلوں کے باعث سیارگاں،
ثابت قائم زمین کے سلسلے میں
اپنی ذمہ داری سے بحل ہیں۔ غیاب
بھلا وجود پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے؟ اور بس یہی وہ
مقام ہے جہاں سے
مرمر کی سل کا معاملہ شروع ہوتا ہے، کیوں کہ یک سمتی

دشمن ہے تناظر کی۔ شاید ایسا ہے کہ
اشیا نے انسانوں کی بہ نسبت زیادہ عجلت کے ساتھ گنوا دی ہے
تولید و توفیر کی خواہش۔ اس سفید قید میں۔

انگریزی (جوزف براڈسکی) سے ترجمہ

یک ہزار و نہ صد و نود و پنج

سرکس کے جوکر اب سرکس کو مسمار کر رہے ہیں۔ ہاتھی سارے کے
سارے ہندوستان بھاگ گئے
فٹ پاتھ پر شیر اپنی دھاریوں اور لہریوں کا سودا کر رہے ہیں
ٹپکتے ہوئے شامیانے کے نیچے، اونچے تار سے، جیسے کپڑوں کی
الماری میں ٹنگا ہوا ہو،
کسی فریب شکستہ جادوگر کا لجلجا ایوننگ سوٹ آویزاں ہے
اور چھوٹے چھوٹے گھوڑوں نے اپنے کشیدہ کار خوگیر اتار
دیئے ہیں اور
ایک نئے انجن کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے لئے بن تن کر کھڑے
ہیں اور سرکس کی معرکہ گاہ میں جوکر
گھٹنوں گھٹنوں لکڑی کے برادے میں غرق،

اپنے بھاری گھن بے تحاشا چلاتے ہیں۔ سرکس منہدم ہو رہا ہے۔
تماشائی یا تو ہیں نہیں یا اگر ہیں تو تالیاں نہیں بجاتے،
بس ایک چھوٹی ذات کی، گھونگھر والے گھنے بالوں والی ولایتی کتیا
بے تکان پیاؤں پیاؤں کئے جا رہی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس
کے حصے کی شکر کی ڈلی
بس اب نزدیک ہی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ کسی بھی لمحے میں، بس
ابھی ابھی
میں انیس سو پچانوے کو جا لوں گی۔

انگریزی (جوزف براڈسکی) سے ترجمہ

سانپ

گرمی، بے حد گرمی کا دن
میں گرمی کے باعث محض نائٹ سوٹ میں تھا
کہ میرے گھر کی ناند پر
سانپ آیا

اونچے چھتنار پیڑ کے نیچے اس کی انوکھی خوشبو سے
بھرے ہوئے سائے میں ناند۔
میں سیڑھیاں اتر کر گھڑا اٹھائے چلا تھا، مگر
اب تو انتظار کرنا ہے، کھڑے رہنا اور انتظار کرنا ہے، کیوں کہ وہ تو
مجھ سے پہلے

ناند پر پہنچا تھا

کچی دیوار کی درز میں سے نکل کر تاریکی میں
اس نے اپنا بدن لٹکایا
اور اپنی زرد کتھئی نرم پیٹ والی ڈھیلا ہٹ کو سر سراتے ہوئے
سرکایا، پتھریلی ناند کی لگر تک پہنچایا اور
اپنے حلق کو اس کے پتھریلے فرش پر ٹکایا
اور اس جگہ پر، جہاں ٹونٹی سے بوند بوند پانی ٹپکتا رہا تھا اور
ایک چھوٹی سی شفافی بن گئی تھی
اپنی سیدھی زبان اور منھ سے اس نے بوند بوند پانی پیا
اپنے سیدھے مسوڑھوں کچلیوں کے ذریعہ اپنے ڈھیلے لمبے
بدن میں دور
تک اس نے پانی کو پہنچایا
چپ چاپ۔
میری ناند پر کوئی پہلے ہی سے موجود تھا
اور میں، دوسرے نمبر پر آنے والا، انتظار کرتا ہوا۔

پانی پیتے پیتے اس نے اپنا سر اٹھایا، جیسے
چوپائے کرتے ہیں
اور اس نے اپنی دو شاخہ زبان ہونٹوں سے نکال کر لہرائی اور
ایک لمحے کچھ سوچا

پھر جھک کر تھوڑا سا پانی اور پیا
ایک وجود، مٹی کی طرح بھورا، مٹ میلا سنہرا، زمین کی حرارت بھری
گہرائیوں سے
آیا ہوا۔ صقلیہ، جولائی کے مہینے کا گرم دن اور آتش فشاں پہاڑ
ایٹنا سے دھواں نکلتا ہوا۔
میں نے جو کچھ سیکھا پڑھا تھا، اس کی آواز مجھ سے بولی
اسے مار ڈالنا چاہئے
کیوں کہ صقلیہ میں سیاہ کالے سانپ تو معصوم ہوتے ہیں، اور
سنہرے سانپ

زہریلے ہوتے ہیں
میرے اندر کی آوازوں نے کہا: اگر تم مرد ہو
تو اٹھاؤ لاٹھی اور اس کی کمر توڑ دو، اس کا صفایا کر دو۔

لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگا
مجھے بے حد خوشی تھی کہ وہ کسی مہمان کی طرح چپ چاپ میری ناند پر
پانی پینے آیا
اور پھر امن وآشتی سے بھرپور، آسودہ، شکریہ ادا کیئے یا وصول کیئے بغیر
اس زمین کی حرارت بھری گہرائی میں واپس اتر گیا۔
میں نے جو اس کو مارا نہیں، تو کیا وہ بزدلی تھی ؟
کیا یہ ایک طرح کی الٹی جھک تھی، کہ میرا دل اس سے بات کرنے کو
چاہتا تھا؟
کیا یہ انکسار تھا کہ اس کی آمد پر مجھے افتخار محسوس ہوا؟
افتخار مجھے محسوس تو بے حد ہوا تھا۔

لیکن پھر بھی وہ آوازیں :
تم اگر ڈرپوک نہ ہوتے تو تم اسے ختم کر دیتے

اور سچ مچ مجھے ڈر لگ رہا تھا، بے حد
لیکن اس کے ساتھ ساتھ عجب طرح کی عزت و افتخار بھی
کہ اس نے پراسرار زمین کا تاریک دروازہ کھول کر

میری مہمان نوازی کو قبول کیا تھا۔

اس نے جی بھر کر پیا
اور اپنا سر اٹھایا، ایک خواب آلود انداز میں، جیسے نشے میں ہو
اور اپنی زبان لپ لپائی، زبان جو بجلی کے تڑاتے کے ذریعہ ٹوٹی ہوئی
رات کی طرح تھی، ہوائیں، جو کس قدر سیاہ تھی
ایسا لگ رہا تھا گویا وہ اپنے ہونٹ چاٹ رہا ہو
اور اس نے لہراتے ہوئے ہوائیں نظر دوڑائی، نہ دیکھتے ہوئے،
جیسے کوئی دیوتا، اور دھیرے دھیرے اپنے سر کو گھمایا
اور دھیرے دھیرے، بہت ہی دھیرے دھیرے، جیسے خواب کی
تین تہوں میں ہو
اس نے اپنی سست طوالت کو لہراتے ہوئے کھینچا
اور میری کچی دیوار کے ٹوٹے گھاٹ پر چڑھنا شروع کیا۔

اور جب اس نے اپنا سر اس بھیانک سوراخ میں ڈالا
اور جب وہ آہستہ آہستہ سمٹا، اپنے کندھوں کو سانپ سکوڑ کر
مزید گہرائی میں اترا

تو ایک طرح کی نفرت بھرا خوف، ایک طرح کا احتجاج
اس بات کے خلاف کہ وہ اس ڈراؤنی بانبی میں کیوں اتر گیا
اس کا جان بوجھ کر اس سیاہی میں داخل ہونا، اور آہستہ آہستہ اپنے کو
کھینچ کر اندر ڈال لینا۔
اب جب کہ اس کی پشت میری جانب تھی تو یہ احتجاج مجھ پر چھا گیا،
قابض ہو گیا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، گھڑا زمین پر رکھ دیا
ایک بھدا بھونڈا سا لکڑی کا چیلا اٹھایا
اور اسے پتھریلی ناند پر کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دے مارا۔
میرا خیال ہے اس کو چوٹ لگی نہیں۔
لیکن اس کا وہ حصہ جو ابھی باہر رہ گیا تھا، وہ وقار سے عاری سرعت
کے ساتھ
تڑپھڑایا، بجلی کی طرح تڑپا، اور غائب ہو گیا
اسی سیاہ سوراخ میں، دیوار کے سامنے والے حصے میں بنی ہوئی
خاکستری لبوں والی
درز میں۔ اور میں اس شدید، خاموش دوپہر میں

اس کو عجب فریفتگی کے عالم میں دیکھتا رہا۔

اور فوراً ہی مجھے افسوس اور شرمندگی کا احساس ہوا
میں نے سوچا یہ میری حرکت کس قدر چھوٹی، کتنی سفیہانہ اور کتنی
ذلیل تھی
میں نے اپنے لئے اور اپنی لعنت زدہ انسانی تعلیم کے لئے
حقارت اور ناپسندیدگی محسوس کی۔

اور مجھے کولرج کی نظم والی البٹراس[1] یاد آئی
میں نے سوچا کاش وہ واپس آجائے، میرا سانپ
کیوں کہ اب پھر وہ مجھے کسی بادشاہ جیسا لگنے لگا تھا
جیسے کوئی جلاوطن بادشاہ، تحت الثریٰ میں بے تاج
اور اب پھر اس کی تاج پوشی کا وقت تھا

اور اس طرح اشرف الحیوانات کے ایک رکن

---

[1] ۔ کولرج کی نظم The Rime of the Ancient Mariner میں ایک ملاح ایک بے گناہ البٹراس (ایک بڑا پرند) کو بے وجہ مار ڈالتا ہے، پھر اسے اس کی سزا ملتی ہے۔

کے ساتھ مجھے جو ایک موقع ملا تھا، وہ
میں نے گنوا دیا۔
اور مجھے ایک چیز کا کفارہ ادا کرنا ہے
اپنے ٹچے پن کا

انگریزی (ڈی۔ ایچ۔ لارنس) سے ترجمہ

کئی سوالوں کے جواب

کیا شے ہے وہ مرد جس کے طالب ہیں
عورتوں میں ؟
خواہش آسودہ کے خال وخد
کیا شے ہے وہ عورتیں جس کا مطالبہ کرتی ہیں
مردوں سے ؟
خواہش آسودہ کے خال وخد

نگاہ الفت
متوحش کرتی ہے کہ وہ
آتش آگندہ ہے
لیکن ملائم فریب کی آنکھ

چاہت کو غلام کر لیتی ہے

ملائم فریب اور سست بنیادی
عشق کے سب سے پیارے بھیس، سب سے دل کش انداز
جو کوئی خود کو
بس ایک شادمانی کا پابند کرے
وہ بال و پرِ حیات کو تاراج و تلف کرتا ہے
اور وہ جو لذت پرّاں کو عالم بال افشانی میں
چوم کر چھوڑ دے اس کا بسیرا
طلوع آفتاب ازل میں ہے

انگریزی (ولیم بلیک) سے ترجمہ

افشائے راز

اپنے عشق کا حال بیان کرنے کی
کبھی کوشش بھی نہ کرنا۔ عشق کا حال
کبھی بیان ہو نہیں سکتا کہ ہلکی نرم ہوا
نادیدہ چپکے چپکے بہتی جاتی ہے

میں نے اپنی محبوب کو بتا دیا۔ رازِ عشق
کھول دیا۔ میں نے اس سے
اپنے دل کا سب حال کہہ ڈالا
اور وہ لرزہ براندام، سرد، خوف سے زرد
اٹھ کر چلی گئی

اور جیسے ہی وہ میرے پاس سے اٹھی

اک مسافر کہیں سے آیا
نادیدہ چپکے چپکے آیا
اس نے ایک آہ بھری
اور میری محبوب کو اپنا کرلیا

انگریزی (ولیم بلیک) سے ترجمہ

میں نے ایک چور سے کہا

میں نے ایک چور سے کہا
مجھے ایک شفتالو توڑ دے
اس نے گول گول دیدے گھمائے اور چپ رہا
میں نے ایک دبلی پتلی کامنی سی بیگم سے کہا
آؤ میرے بستر میں آؤ
حلیم اور پاکیزہ، وہ آنکھ میں آنسو بھر لائی

میرے جاتے ہی ایک فرشتہ آیا
چور پر وہ چشمک زن ہوا اور بیگم
سے اس نے تبسم کیا

اور پھر کسی کے ایک لفظ بھی بولے بغیر

پیڑ سے اس نے شفتالو لیا
اور دوشیزہ سی چپ چاپ
اس نے بیگم کے مزے لوٹے

انگریزی (ولیم بلیک) سے ترجمہ

گلبن میرا پیارا

میرے سامنے ایک پھول رکھا گیا
ایسا پھول کسی بھی موسم بہار میں
بھلا کیا کھلا ہوگا۔ لیکن
میں نے کہا: میرے پاس تو خود ہی ایک پیارا پیارا گلبن ہے
اور میں نے اس گل خوشبو سے صرف نظر کیا

پھر میں اپنے پیارے گلبن پر گیا
کہ شباں روز اس کی دیکھ بھال کروں
خدمت کروں

لیکن غیرت کے مارے میرے گلاب نے
منھ پھیر لیا۔ اور بس اس کے کانٹے ہی
میرا مایۂ راحت بنے

انگریزی (ولیم بلیک) سے ترجمہ

رباعی، قطعہ

رباعی

سرگوشی تیری سرِ بازار سنوں
جنگل کی زبانی ترا اقرار سنوں
تو گہری ناگن سی خموشی میں مجھے
اک بار بلائے تو میں سو بار سنوں

سات تضمینی رباعیاں

شیخ فخرالدین عراقی

اب میں ہوں اور آفاق کی پہنائی دشت
سر پر بھاری آبِ تمنا کا طشت
تشنہ بہ کنار جوے چنداں خفتم
کز جوے من آب زندگانی بگذشت

شیخ فرید الدین عطار

سانسیں نہ شمار کر کہ شش ہیں یا ہفت
سب ایک ہیں دلق یا لباس زربفت
از موت و حیات چند پرسی آخر
خورشید بہ روزنے درافتاد و برفت

لا اعلم

ہے حال میں ماضی حال میں مست
لکھا ہے خط شکست میں بود و ہست
ہم روے زمیں پر است وہم زیر زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

استاد ابوالفرج رونی

دل ہی دل میں تجھ سے یہ باتیں کرنا
مٹ جائے کسی طرح سے قسمت کا لکھا
کارے کہ من اختیار کردم ایں بود
باقی ہمہ کار اتفاقی ست مرا

شیخ ابوسعید ابی الخیر

ملتی نہیں غیر سے یہ سرحد ہرگز
اوروں کے لئے نہیں یہ مسند ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر کسے دگر نہ روید ہرگز

مولانا صوفی مازندرانی

ہے فرق بہت از مردی تا مردی
کس شیر نے تجھ عشق ییں کی پامردی
امروز چناں قحط رجال است کہ من
نہ مرد زمانہ ام بدیں نامردی

میرزا عبدالقادر بیدل

اوروں کے معنی پہ بڑھا کر تمہید
پھیلایا مضمون کی چادر کو مزید
گفتم سخنے لیک پس از کسب کمال
خواہی فہمید چوں نہ خواہی فہمید

رباعی ۲۰۰۱

ہستی پر بنیاد نہ ہونے دینا
مقصود کو برباد نہ ہونے دینا
اے دشت خلا کا عزم کرنے والے
سیمرغ[1] کو آزاد نہ ہونے دینا

---

[1] نظامی کی مثنوی "ہفت پیکر" میں بادشاہ سیمرغ پر سوار ہو کر ایک نئی دنیا کا سفر کرتا ہے جہاں جنات کی حکومت ہے۔

لالچ بھری چار رباعیاں

نشان کی چار سمتیں

طاؤس نما غنچۂ خواہش کا نشاں
ناخن کی بدن گرم پہ کاوش کا نشاں
سوکھے پتوں پہ شب کی بارش کا نشاں
بھیگے کاغذ پہ جاں کی کاہش کا نشاں

رنگ کے چار رنگ

روشن سنسان سرخ بادل کا رنگ
پہلو میں شگاف شام مقتل کا رنگ
طوطا چشمی بھورا جنگل کا رنگ
پیچیدہ لذیذ لمس اول کا رنگ

لوائح اربعہ

گنجان بھرے باغ میں خوشبو کی چمک
چشم بے خواب زرد جگنو کی چمک
بستر پہ دراز یار دلجو کی چمک
شب دشت مگر چاندنی آہو کی چمک

مسیحائے شوق

خار آہن ہوں برگ زر ہو جاؤں
سوکھی کھیتی ہوں چشم تر ہو جاؤں
ہلکا سا ترے پاؤں پہ یہ چوٹ کا داغ
میں چھولوں اس کو تو امر ہو جاؤں

رباعی سب رنگ

تجھ مہر سے روشن ہوئے ہیں راتوں رنگ
تجھ آنکھ سے برسے ہیں برساتوں رنگ
دل چیر کے میرا کبھی دیکھا ہوتا
کس طرح اچھلتا ہے لہو ساتوں رنگ

پکی عمر کی رباعیاں (۱۹۹۶)

آساں رگِ گردن کو توڑا اس نے
توڑا کیا سب لہو نچوڑا اس نے
وہ دل کہ تھا ضرب و حرب عشق میں طاق
اس دل کو بنا دیا بھگوڑا اس نے

جو عقل کے جھانسے میں نہ آئے وہ ہے دل
جو من مانی کرتا جائے وہ ہے دل
اک بوند گنہ پر سو قلزم روئے
پھر ناکردہ پر پچھتائے وہ ہے دل

ٹھنڈی جھوٹی ضو سے روشن ہے دماغ
ہو بات بہانوں کی تو پرفن ہے دماغ
بچپن کے خوابوں کا رہزن ہے دماغ
نورِ نظر دل کا دشمن ہے دماغ

ہو داغ نہاں دل میں تو شق ہو گا جگر
دابو گے فغاں دل میں تو شق ہو گا جگر
چپ چاپ سے دنیا تج کر خود سے اگر
ہو حرف زناں دل میں تو شق ہو گا جگر

عرفان کے دریا سی پراسرار ہے آنکھ
خوش گو ہے مگر مانع گفتار ہے آنکھ
جب شرم سے اٹھے نہ تو بیمار ہے آنکھ
با ایں ہمہ عیاروں کی عیار ہے آنکھ

جو بات ہے دل میں وہی کہتی ہے آنکھ
خالی ہو سبو ے دل تو بہتی ہے آنکھ
کانٹے کی چبھن پلک پہ سہتی ہے آنکھ
ہاں سینۂ سوزاں میں بھی رہتی ہے آنکھ

ہر عضو بدن نگیں نگیں تاج ہے دل
یاقوت جگر رنگ کی معراج ہے دل
یا شاخ زبرجد میں ہے ہیرے کی قلم
یا سارا لہو روے تو پکھراج ہے دل

ہر لذت کا منبع و مخرج ہے دل
جنگل ہے بدن جنگل کا گج ہے دل
کج باز ہو تم صاحب تو کج ہے دل
درویشوں میں زر مروج ہے دل

شیطان کسی طرح یہ مرتا ہی نہیں
بندے سے نہ مالک سے ڈرتا ہی نہیں
گم نامی و ذلت کے بھی غاروں سے عمیق
دل ایسا جہنم ہے کہ بھرتا ہی نہیں

اب نام وہ لوح دل سے ہم چھیلیں گے
بیتی باتیں زہر صفت پی لیں گے
سینے پہ ہے جو سانپ اسے یوں کیلیں گے
ہم رشتۂ افسوس سے منھ سی لیں گے

گو کل میں جو ہو خاک وہی ہے میرا
انگلی پہ نہ روشن ہو تو کیسا ہیرا
دل میرا تھا مثال در مکتوم
سینے کو کسی نے بھی نہ میرے چیرا

شہرت کی ہوس کہ حب دنیا نکلے
کس کو خبر اندر مرے کیا کیا نکلے
دہشت سے امید سے سینچا تھا جسے
ممکن نہیں پہلو سے وہ کانٹا نکلے

ہے سارا بدن شگفتہ مثل گل نو
یوں بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے جیسے لو
ہیں آنکھ کے سب کرشمے از سر تا پا
اس آنکھ پہ پڑتا ہے خدا کا پرتو

ساغر نہ تھا وہ بزم میں توڑا جس کو
یا کوئی جلا پھپھولا پھوڑا جس کو
بنیاد کہنہ تھا نہ ویراں بستی
انسان تھا وہ بھی تم نے چھوڑا جس کو

دل میں آب اس نگہ کے خنجر کی ہے
بجلی سے نوک اس کی برابر کی ہے
بجلی میں بتاؤ کبھی لگتا ہے زنگ
یہ نوک چمک تو زندگی بھر کی ہے

آخر ترے ہجراں سے مری پٹ ہی گئی
تو تو ہے یہ بات مجھے رٹ ہی گئی
ہر چند کہ بے شرم تھی حرافۂ شب
بے خوابی مری دیکھی تو کٹ ہی گئی

مہجوری کے آداب سکھاتا کیسے
اپنے کو اجنبی بتاتا کیسے
جسموں کا فاصلہ تو اک دم میں ہے طے
دوری کا سبق دل کو پڑھاتا کیسے

کچی گیلی لکڑی جلتی کیسے
ٹہنی تھی بے اصل تو پھلتی کیسے
میں دور ہی دور اس کی راہوں سے رہا
مجھ دل پہ وہ پاؤں رکھ کے چلتی کیسے

ہے کام ترا ہجر میں تپنا کہتی
بس دور سے اب مالا جپنا کہتی
تلوے میں چبھتا ہوا کنکر سا مجھے
اک درد کہ الجھن سہی اپنا کہتی

ساون کا سبزہ ہی دکھایا ہوتا
ابری نہیں یک رنگ بنایا ہوتا
تو نے تو نمک زار میں بویا مجھ کو
کوڑے کے ہی ڈھیر پر کھلایا ہوتا

مثل موج صبا جگانے آئی
سوناز اٹھوائے تب اٹھانے آئی
کم بخت نے تاخیر بہت کی لیکن
آئی تو سناتی شادیانے آئی

تاریخ بنائے خانہ

من یکے باشم کہ از بہر بقا
می نہم ایں یک دو خشت بے مثیل

قبلۂ من گفت بیت الشمس گو
کز خدا شد ایں نشیمن بے عدیل

گفت ہاتف زود تا رنجش بگو
تو کہ باشی ذو فنوں زیرک عقیل

گفتمش برجستہ ایں مصراع چست
دیدہ باید بست گلزار خلیل

۱۳۹۰

علیسوی گفتم چہ طور آمد پدید
گفت بر ہر خشت بنویساں خلیل

۱۹۷۰ = ۶۷۰ + ۱۳۰۰

یہ الہ آباد میں میرے مکان کی تاریخ تعمیر ہے۔ ہجری مادۂ تاریخ میں نکتہ یہ ہے کہ والد مرحوم کا اسم گرامی محمد خلیل الرحمٰن تھا، اور انھوں نے ہمارے آبائی وطن موضع کوریاپار ضلع اعظم گڈھ میں اپنے لئے جو مکان بنوایا تھا اس کا نام بھی گلزار خلیل تھا۔ عیسوی تاریخ بھی انھیں کے نام کی مناسبت سے ہے۔ میں اسے اپنے مرحوم باپ کی یاد میں شائع کر رہا ہوں۔ اب تک یہ غیر مطبوعہ رہی ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات سید العلماء
حضرت مولانا سید علی نقی نقوی عرف نقّن صاحب

چو آن شناور معنی علی نقی نقوی
کنارہ کرد ازیں بحرِ اشک و رنج و محن

ز ارض تا بہ فلک سیل گریہ گشت بلند
کہ انس و جن بہ غم او شدند در شیون

زعیم شرع نبی قاطع ضلال و کفر
تدبرش پئے تنویر دیں ضیا افگن

تعقلش سند محکم امور نبی
تفکرش پئے مسلم دلیل شد بین

حدیث و علم کلام خدا و ذکر امام
ز بوے اوست معطر ہزارہا گلشن

چو او برفت دل از دست ملک و ملت رفت
چساں تحمل ایں داغ بے دلی کردن

۱۹۸۸

قطعۂ تاریخ وفات شیخ المشائخ بقیۃ السلف
حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی المتخلص بہ احمد

بس کہ شیخ المشائخ تھا ان کا لقب
ساری دنیا سے ان کو عقیدت ملی

زندگی بھر لکھا سوز دل کا بیاں
زیست عشق نبیؐ ذکر رب شاعری

صورت فضل رحمٰنؒ زمانے میں تھے
ان کو دیکھا شبیہہ ولی دیکھ لی

مطمئن جان تھی راضیہ مرضیہ
قلب نے جب صدا ارجعی کی سنی

روح احمد بھی رب محمدؐ سے پھر
سن لے یہ مژدہ اب فادخلی جنتی

۱۴۱۲

قطعۂ[۱] تاریخ وفات شیخ المشائخ بقیۃ السلف
حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی المتخلص بہ احمد

چو آں عارف کامل جواں مرد راہ حق
تہی کرد قالب را پر امید لطف رب

زجنت پئے تقدیم رضواں فرود آمد
پیام خدا آورد دادم ترا منصب

---

[۱] بحر طویل مثمن سالم فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن دوبار

بیا اے محمد احمد اے شان رحمانی
توئی صدر آں مجلس درو نیست روز شب

قدم زد چو در مجلس صدا از سروش آمد
لگا ہے کن اندر دل الٰہی ربک فارغب

۱۹۹۱

نظم

سبز سورج کی کرن

سبز بلی سبز
آنکھیں سبز
سورج کی کرن
جب نیم خوابی کی طرح اس آنکھ اوپر
جھولتی ہے جھومتی ہے، سبز
آنکھیں سبز روشن
رنگ کی باریک لہریں
ارغوانی قرمزی تھوڑا بہت سونے کا جھلمل رنگ . . .

آنکھیں زندگی بنتی ہیں۔ دھندلی روشنی میں

سبز بھوری آنکھیں کھلتی ہیں تو فوراً
قمقمے سی کھلکھلاتی
بے محابا روشنی ہر گوشے سے کھنچ کر سمٹ آتی ہے بھوری سبز
چشم بے حجابی کوندتی ہے

دھوپ کی گرمی نظر
بے باک عریاں
پھیلتے پارے کی صورت شاہراہوں اور گھروں میں
موجزن ہے۔ سبز آنکھیں سبز
شفاف آبگینہ بن گئی ہیں

بیان صفائی

رات اترتی گئی
مجھ کو خبر ہی نہ تھی
کاغذ بے رنگ میں سرد ہوس جنگ میں
صبح سے مصروف لوگ اپنی چادر میں بند
آنکھ کھٹکتی نہیں،
دل پہ برستی نہیں
خشک ہنسی بے نمک شہر فضا میں بلند
تنگ گلی کی ہوا
شام کو چوہوں کی دوڑ

تیز قدم گربۂ شاہ جہاں کب جھپٹ لے گی کسے
کیا پتہ؟

نیند کا اونچا مکاں روشنیوں سے سجا
ہم سب کی کھڑکیاں دروازے بند ہیں
گھر کی چھتیں آہنی
(گھر کی حفاظت کرو گھر کی حفاظت کرو)

رات اترتی رہے، ہم کو دکھائی نہ دے
ہم پہ ہو الزام کیوں؟

سینہ فگاری کی شان کے لئے دعا

خلد نشاں زیست اگر چاہیئے
ذکر نبیؐ شام و سحر چاہیئے
دست بدل سجدے میں سر چاہیئے

پہلے قلم کیجئے دل کا شجر
لائیے پھر سرخی خون جگر
وصف محمدؐ کو ہنر چاہیئے

تخت ہے ان کا فلک ہفتمیں
نور مگر جلوہ نما ہر کہیں
دیکھنے کو دیدۂ تر چاہیئے

مال و زر و جاہ و حشم بے اثر
بہر نثار ان کے در پاک پر
جوے رگ جاں سے گہر چاہیئے

مجھ کو ملے سینہ نگاری کی شان
دل پہ بنے ان کے قدم کا نشان
لے لے جیسے شمس و قمر چاہیئے

ولقد راٰہ بالافق المبین

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ

(القرآن سورۃ التکویر)

اور تمھارا سنگاتی باولا نہیں ہے
اور سچ ہے اس نے اس کو اجلے کنڈل آکاس میں دیکھا ہے
اور وہ گیان دھیان کا کنجوس نہیں ہے
(ترجمہ، حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی)

جس نے تیری کمر کا ٹیڑھا بوجھ
سایۂ برگ میں بدل ڈالا۔ جس نے اس کو بنا دیا خوشبو
وا ہوا زرنگار دروازہ

وسوسے خوف کے کچھ کے رنج
وسعت خانۂ خلا بے علم
اس میں نور یقیں کی تنہائی
کائنات اجنبی اتھاہ شدید
اس میں نازک یہ گل کھلے نہ کھلے

جس نے تجھ کو نہان تاریکی
کرب تنہا و بے اثر دربند سے بچایا
کلام تجھ سے کیا
جب اڑی باد مہر کی خوشبو
سینۂ نرم چاک و پاک ہوا

جس نے افلاک قوت و نخوت کے سفیروں کو آستاں پہ ترے
سرو قد عصمت و صفائے دل سے مزین
سجو دیں رکھا
جس نے تیرے لئے ترا ہی ذکر
مثل کوہ ندا بلند کیا

تو وہ گل تھا جو کشت غربت میں
نو دمیدہ تھا اور اس نے تجھے
ہر دو عالم تونگری بخشی
تو وہ ابن السبیل تھا جس کو
اس نے ہر شاہراہ ارض و فلک کی مسافت کا بادشاہ کیا
تو وہ شب زندہ دار تھا جس کو
اپنی لاحد و لازوال نگہ کے اشارے سے صبح گہ کے قریب
بے نہایت افق کے کونے پر
اس نے اک نجم شوخ دکھلایا

جس نے پیشانی منور اور
چشم شاہین رکھنے والے کئی
تجھ کو اصحاب جاں نثار دیئے

وہ ترا رب تھا دوست تھا کیا تھا

آخری تماشائی

اٹھو کہ وقت ختم ہو گیا
تماش بینوں میں تم آخری ہی رہ گئے ہو
اب چلو
یہاں سے آسمان تک تمام شہر چادریں لپیٹ لی گئیں
زمین سنگریزہ سخت
دانت سی سفید ملگجی دکھائی دے رہی ہے ہر طرف
تمھیں جہاں گمان سبزہ تھا
وہاں جھلک رہی ہے کہنہ کاغذوں کی برف
وہ جو چلے گئے انھیں تو اختتامیے کے سب سیاہ منظروں کا علم تھا

وہ پہلے آئے تھے اسی لئے وہ عقل مند تھے، تمھیں
تو صبح کا پتہ نہ شام کی خبر، تمھیں تو
اتنا بھی پتہ نہیں کہ کھیل ختم ہو تو اس کو شام
کہتے ہیں۔ اے ننھے شائقان رقص!
اب گھروں کو جاؤ

شور تھمنے کے بعد

اب شور تھما تو میں نے جانا
آدھی کے قریب رو چکی ہے
شب ، گرد کو اشک دھو چکی ہے
چادر کالی خلا کی مجھ پر
بھاری ہے مثل موت شہپر

ہے سانس کو رکنے کا بہانہ
تسبیح سے ٹوٹتا ہے دانہ

میں نقطہ حقیر آسمانی —
بے فصل ہے بے زماں ہے تو بھی

کہتی ہے یہ فلسفہ طرازی

لیکن یہ سنسناتی وسعت
اتنی بے حرف و بے مروت
آمادۂ حرب لازمانی
دشمن کی اجنبی نشانی

خواب کا خطر

میں خواب اگر نہ دیکھتا تو
اک لمحے کا کھیل تھا افق پر بس
شب کے صحرا میں جھلملا کر
من موہنی جنگلی بھیانک
لہراتی صورتیں دکھا کر
چپ چاپ جھپک کے کھو گیا ہوتا
میں سو جو گیا تو کھو گیا یعنی
خواب میں بس سوال دیکھے

سورج میں سیاہ داغ کیا ہیں
قوت کے دھارے کیوں ابلتے ہیں
پانی میں بھی کیا چراغ جلتے ہیں

آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے[1]
کیا نسبت جسم کو ہے جاں سے
جلنے کا پگھلنے کاٹنے کا
آنکھوں کو ہنر سکھایا کس نے
لپٹی ہے زمین خاک پر کیوں
اُگتی ہے شراب تاک پر کیوں
آغاز میں انتہا ہے کیا معنی
نقطہ نقطہ خدا ہے کیا معنی
سب کھیل یہ سرپھرے سوالوں کا
اک ذرہ آسماں پہ چمکا تھا
اک عمر کٹی نہ حل ہوا کچھ

اے کاش نہ خواب دیکھتا میں

---

[1] یہ مصرع میر درد کا ہے۔

اجگر، جوگی، ڈومنی اور پیڑ

رونا اور چلانا میرا کام ہے۔ کیوں کہ مجھے بخوبی علم ہے رونے اور چلانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

بہت دنوں کی بات ہے، تقریباً میرے بچپن کی۔ کچھ لوگوں نے ایک گھنے درخت پر اک لمبی کالی موٹی چیز سی دیکھی۔ وہ سمجھے یہ شاید کسی کی کالی اوڑھنی ہے، شاخوں میں الجھ کر ہوا میں لہراتی ہے۔ کسی کے پاس اک لمبا بانس ہو تو اس کو کھینچ اتاریں، کام میں لائیں۔

اک صاحب بولے اجی یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ نظر کا دھوکا ہے۔ تم کو معلوم ہے روشنی کیسے کیسے دھندے کرتی ہے؟

اجگر ہے اجگر ہے اک بچہ چیخا بھاگو بھاگو اجگر ہے۔ بچہ تو گرتا پڑتا ماں کو پکارتا گھر کو بھاگا اور بڑے بوڑھوں نے کہا

شاید یہ کہیں اجگر ہی نہ ہو۔ پھر ایک سے ایک پرانے سپیرے مداری بلائے گئے کہ پکڑو باندھو بڑا بھیانک اجگر ہے۔ کسی کو کاٹے تو لہر نہ آئے، پانی پانی ہو کر بہہ جائے گا۔ ایک بزرگ بولے، نہیں یہ زہریلا تو نہیں ہے لیکن اپنے بلوں میں جکڑ لے تو ہڈی ہڈی پارہ پارہ کر کے کھا جائے گا۔

اجگر کا لہرانا اب بند تھا لیکن وہ لمبی کالی پٹی اک موٹی سی شاخ کے گرد یوں لپٹی تھی جیسے جنم جنم کی پیاسی ہو۔ کسی کسی کو اس کے تکونے چتکبرے سر کی جھلک آجاتی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ پھر اس کو وہم سا ہوتا، میری پیٹھ کو اک ٹھنڈی پتلی لال زبان دوشاخہ چاٹ رہی ہے۔ گرم پسینہ بھل بھل کرتا، سارے بدن میں گندی تری پھیلنے لگتی۔

اجگر اور درخت کے سائے مل کر ایک ہوئے۔ شام کی گاڑھی مہک آنکھ میں اتری۔ اک اک کر کے سارے سپیرے سارے مداری ہار گئے۔ کوئی منتر کام نہ آیا۔ تھوڑے بہت لوگ جن میں ہمت باقی تھی پیڑ سے کچھ دور حلقہ بنائے کھڑے رہے۔ ان کی شکلیں دھندلی ہونے لگی تھیں۔ اور اس پیڑ پہ ایک پرندہ نہ تھا۔ سناٹا تھا۔

شام کے چولھوں کے میٹھے دھوئیں میں لپٹا ایک سپیرا اچانک آیا۔ اس نے کہا اس اجگر کو میں پکڑوں گا تم سب اندھے اناڑی ہو۔ اس نے ایک بڑے منہ کی ٹوکری جیسی چیز درخت کے نیچے رکھی۔ ٹھیک اس شاخ کے نیچے جو اندازاً اجگر کی آغوش میں تھی۔ پھر وہ چیخا — آجا ۔ آجا ۔ میں ماروں گا نہیں بس پکڑوں گا لے جاؤں گا۔

آجا ۔ آجا ۔ آجا ۔ میں ماروں گا نہیں بس پکڑوں گا لے جاؤں گا۔ ساری رات اس جوگی کی بس یہی اک الاپ تھی۔ آجا ۔ آ ۔ ماروں گا نہیں بس پکڑوں گا لے جاؤں گا۔ رات چرانے والے لمحے چپکے گزرتے گئے۔ اس پیڑ کو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔ اک پتی بھی ہلتی نہ تھی۔ گھروں کی چھتیں تک جوگی کے شور و غل، غرانے سے گونج رہی تھیں۔ آ ۔ آ ۔ آ ۔ جا ۔ لے جاؤں گا۔ مت ڈر میں پکڑوں گا لے جاؤں گا۔

گندی مٹ میلی سی صبح نے دور سے جھانکا۔ اجگر والا پیڑ ابھی تک اک دھبہ سا لگتا تھا اور اجگر کا گدلا رنگ آسمان پر بھی تھا۔ اور سپیرے کا غل دور سے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ماتم کرتا ہو۔ آ ۔ آ ۔ آجا ۔ لے جاؤں گا۔

پھر ایک عجیب سی کھل بل کرتی خشک صدا کے ساتھ
وہ اجگر دھب سے نیچے گرا۔ ٹھیک اسی ٹوکری میں ٹپکا جیسے
پکا کٹھل گرتا ہے۔

جوگی نے لپک کر ٹوکری پر ڈھکن رکھا۔ ٹوکری سر پر
رکھی اور چلتا بنا۔ تھوڑی دیر میں ایسا لگنے لگا جیسے کوئی بات
ہوئی ہی نہ تھی۔ اور اس پیڑ کو سات ڈومنیوں نے اپنے گھر
کی خاطر تاک لیا۔ آپ نے شاید ڈومنی دیکھی ہو۔ خاکی رنگ
اور پیلی آنکھیں، پتلی چونچ، بدن پھلائے عجب عجب آوازیں
کرتی ہے۔ خواہ مخواہ ہنسی آنے لگتی ہے۔

سچ ہے رونا اور چلانا آہیں بھرنا میرا کام ہے لیکن میں
خوب جانتا ہوں رونے اور چلانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اجگر
جوگی ڈومنی اور پیڑ اک گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں؟

ڈبلیو۔بی۔ییٹس کے اعزاز میں

I have not lost desire
But the heart that I had;
I thought 'twould burn my body
Laid on the death-bed,
For who could have foretold
That the heart grows old?

W. B. Yeats

جب میں تمام نقش ہوا دل سے دھو چکا
جب میں گذشتہ سارے مراسم کو رو چکا
جب میں لہو میں زہر کی سوئی ڈبو چکا
جب میں تمام رات جلا، جل کے ہو چکا

سمجھا تھا میں کہ دل ہے چراغِ بہارِ شب
جب رات ہے تو سبز ہے باغِ بہارِ شب
جب شب نہیں تو دل بھی ہے داغِ بہارِ شب

مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہوس شعلہ جان و دل
جسم و دماغ میں ہے سراپا ے مشتعل

یہ اشتعال داغ تماشا ہو کچھ بھی ہو
یہ دل کا خون ہے یہ رگوں کا جنوں بھی ہے
زنجیر ہو ہوائی اندھیرا ہو کچھ بھی ہو
صدرہ شکست ہو کے بنے وہ فسوں بھی ہے

دل کو مفر نہیں ہے تو مجھ کو اماں نہیں
دریا میں غرق ہو کے بھی دھلتا نشاں نہیں

صد جوش موج حلقۂ زنجیر بن گیا
ٹپکا کبھی تھا اشک جو تصویر بن گیا

نمودِ پر شکستہ شب

(مراد آباد ۱۹۸۰)

مجھے معلوم ہے تم لوگ واپس اب نہ آؤ گے
مری دھندلی نظر بھی دور شیروں کو کبھی ساکن
کبھی لہروں کی صورت سرسراتے دیکھ سکتی ہے
تمھارا وعدہ ہے فوجوں کی صف در صف تمھارے ساتھ ہوگی،
پھر نہیں ممکن
کہ تم دوبارہ ہم زخمی نکموں کا تحفظ کر نہ پاؤ گے

تمھاری آنکھ تو سرحد کے آگے بھی ظفر موجوں کو اونچا لہلہاتے
دیکھ سکتی ہے

نمود پر شکستہ شب

یہ مٹی وہ ہے
اک قطرہ لہو بھی چاٹ جائے تو مگرمچھ سا دہانہ کھول دیتی ہے
یہاں تو کچھ تمھارا خون ہے اور پھر بہت سارا ہے ہم جیسوں نکموں کا
تمھارے کان کیا سن ہیں؟ بھیانک وہ جماہی تم بھی سنتے ہو
یہ کیسا باغ ہے، تم کاغذی سب پھول چنتے ہو
چراغ سرخ سی آنکھوں سے بچتے ہو، مقدر ہیں وہ ہم جیسوں کے
جسموں کا

ذرا ہٹ جاؤ پھر دیکھو ہمیں وہ کوڑیوں کے مول لیتی ہے
نمود پر شکستہ شب

تمھارے جانے کی بس دیر ہے پھر اس کے فوراً بعد ہم لوگوں

کے گرد اگرد شیروں بھیڑیوں کتوں کے جبڑے مسکراہٹ
کڑکڑائیں گے
کہیں حد نظر کے پار بے حرکت مڑی منقاروں سرد آنکھوں
کثافت پوش ناخن گردنوں والے
درختوں کی بلندی سے ہمارے ٹوٹتے جسموں
پہ جبڑوں کی کرخت آواز سنتے ہی اندھیرے بھورے پر بھی
پھٹ پھٹائیں گے
تم ایسے وقت کتنی دور ہو گے اے صبا رفتار توسن بھاگنے والے؟
نمود پرشکستہ شب

اندر قیاس ما نہ گنجد

زرد سنگین صحرا پر
بارشیں آگئیں ۔ دنیا
سرمنڈی راہبہ تھی، نم
آسمانی ہواؤں نے اس کے دل میں ہوس لہریں
زندہ کر دیں۔
تمازت کی نیند میں گم تھیں، جانوں نے سر نکالا
چٹک کر سب دست و بازو گل و چشم نقش تر بن گئے۔
بنجر کو ہری دھار پر رکھ کر
سرد بے باک تیغوں نے خط منسوخ کر ڈالا۔

وزن خود ساختہ : فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن

دودھ تھن میں اگا پھیلا — چکنی گایوں
کی آنکھوں میں نشہ جذب محبت کا۔

دودھ شیریں ہے
بے گنتی خفیہ جانوں کا گہوارہ، حوض کوثر۔

نئے چنچل حرف جاگے۔ زباں شیریں
شہد کی بوند بن کر ٹپکے، ہوائیں
اتر کر حل ہو گئے — گونج بھی
سوکھی شاخ سی جل گئی، خاکستر
نشانی ہے مدھم سی

دودھ میں حل
ہزاروں جو زندہ روحیں تھیں
بد روحوں کی غلامی میں خوش خرم رہ گئیں
شیر شیریں پر
کھٹی بد بو کا مجموعہ چل گیا — اب وہ
مغرور و سرفراز و شگفتہ سر

سبزہ جس نے زمیں کو مغلوب رکھا تھا، اس کی
باری ہے، سوکھے گا
کاٹا جائے گا
پھینکا اڑایا جائے گا

لیکن یہ ہنگامے کیوں کئے تھے ؟

اندھیری شب سے ایک لاحاصل سرگوشی

اندھیری شب کے شرمیلے معطر کان میں اس نے کہا۔ وہ شخص
دور افتادہ لیکن میرے دل کی طرح روشن ہے
جو میرے پاؤں کے تلوے، ہتھیلی کے گلابی گال میں
کانٹا سا چبھتا ہے
جو میرے جسم کی کھیتی پہ بارش کا چھلاوا ہے
وہ جس کی آنکھ کی قاتل
ہوس اک منتظر لیکن نہ ظاہر ہونے والے پھول کی مانند
بے چینی میں رکھتی ہے مجھے ۔ وہ
آنے والا ہے

مگر وہ شخص اس شب بھی نہیں آیا

بھلا ٹوٹی کلائی سے
وہ سارے خواب سب وعدے ملاقاتوں کے پیمانے
کہاں سنبھلیں؟
بھلا بے نور آنکھوں میں وہ صورت
جھم جھماتی تند جوش خون سے گرمیِ لب تک تمتماتی
کس طرح رکتی؟

اندھیری رات نے
دیکھا نہ کچھ سننا ہی چاہا—اس کے گوش نازک اور چشم بسیہ
معصوم ہوتے ہیں۔

رات شہر اور اس کے بچے

سرد میدانوں پہ شبنم۔ سخت
سکڑی شاہ راہوں، منجمد گلیوں پہ
جالا نیند کا۔
مصروف لوگوں، بے ارادہ گھومتے آوارہ گردوں
کا ہجوم بے دماغ اب تھم گیا ہے۔
رنڈیوں زنخوں اچکوں جیب کتروں لوطیوں
کی فوج استعمال کردہ جسم کے مانند ڈھیلی
پڑ گئی ہے۔
سنسناتی روشنی تنہا ہواؤں کی پھسلتی
گودمیں چپ
اونگھتی ہے۔ فرش اور دیوار و در

فٹ پاتھ
کھمبے
دھندلی محرابیں
دکانوں کے سیہ ویران زینے . . .
سب کے ننگے جسم میں شب
نم ہوا کی سوئیاں بے خوف
اترتی کودتی دھومیں مچاتی ہیں۔

کچھ شکستہ تختوں کے پیچھے کئی
معصوم جانیں ہیں
خواب کم خوابی میں لرزاں —

بال و پر میں سرد نشتر
بانس کی ہلکی اکہری بے حفاظت
ٹوکری میں
درجنوں مجبور طائر

زیر پر منقار، منہ ڈھانپے خموشی کے سمندر بے نشاں میں
غرق، بازو بستہ، چپ،
مخلوق خدا جو گول کالی گہری آنکھوں کے
نہ جانے کون سے منظر میں گم ہے۔

غزل

یہ تاب و تب یہ ہوائے ہنر اسی سے ملی
جو شے بھی میری ہوئی معتبر اسی سے ملی

عدم میں کچھ نہ خبر تھی کہ کون ہوں کیا ہوں
کھلی جو آنکھ تو پہلی نظر اسی سے ملی

نہیں ہے شک کہ وہ رشتے نہیں رہے باقی
کہ جس سے ٹوٹے ہیں مجھ کو خبر اسی سے ملی

وہ برق گر کے مری خاک میں ہوئی پیوند
سوادِ جاں کو مرے آبِ زر اسی سے ملی

ہے تیرا جسم جس آتش بہار سے روشن
مرے وجود کو تاب شرر اسی سے ملی

یہ کس بدن کا تصرف ہے روئے صحرا پر
لگائی پیٹھ جو میں نے کمر اسی سے ملی

نشیب شام کے منظر میں کیا چھپا تھا مجھے
یہ جست و جرأت بے بال و پر اسی سے ملی

دلت بلاے دل مائی شود کہ نہ باشد　　　کہ سنگ آفت مینائی شود کہ نہ باشد

ایزد بخش رسا، وفات ۱۷۰۷

بے جنوں عقل کا سودا نہیں ہوتا کہ نہ ہو
بے ہوس عشق کا دعویٰ نہیں ہوتا کہ نہ ہو

لا دوا ہونے دو پہلے مرے دل کا احوال
بے دوائی بھی مداوا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

تم لہو رونے کا فن بھول گئے ورنہ میاں
اشک سے سبزہ یہ صحرا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

دل میں اک سانپ ہے پیچیدہ بہ خود رو بہ قفا
دل کا پتھر آنکھ میں پردہ نہیں ہوتا کہ نہ ہو

شب تاریک ہو جب روح کی تب دیکھو وہ نجم
افق دل پہ ہویدا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

سامنے جاؤ کوئی بھیس ہو اوقات کوئی
تمھیں پہچانے وہ ایسا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

اپنوں کے خون سے ہیں سب ندی نالے رنگیں
باگہر غیر کا دریا نہیں ہوتا کہ نہ ہو

اپنی راہیں بند کروں گا تجھ کو راہ پہ لاؤں گا
جب میں دنیا چھوڑ چکوں گا تب تو تجھے یاد آؤں گا

صدہا آتش گل کا داغ ہے دامن دل پر لیکن میں
تیرے جسم کی آنچ میں تپ لوں پھر نہ کہیں بھی جاؤں گا

سر میں ابھی ہے اتنی شورش حرف زنی ہوتی ہی نہیں
یہ گردن زدنی سر کٹ جائے تو شعر سناؤں گا

یہ دنیا ہے نجس کیا جانے پاکی کس کو کہتے ہیں
جان کو اپنی راکھ کروں گا خون میں اپنے نہاؤں گا

شہر شگوفہ شرار سے روشن گلیاں خون کی پیاسی ہیں
اک میں اپنی شہ رگ سے کس کس کی آگ بجھاؤں گا

شمع بھی سرتاپا جلتی ہے دل کی کچھ تخصیص نہیں
دل کی سحر تو تبھی ہے اسے جب دونوں سروں سے جلاؤں گا

حق کی یہاں کوئی رسم نہیں ٹکے سیر بھی اس کے دام نہیں
لوح مزار کو ابن آدم اپنی زبان سکھاؤں گا

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا (میر)

آنکھ کو پانی کیا دل کو پتھر کر لیا
میں نے خود کو بھولنے میں ہنر ور کر لیا

رگ میں نشتر کر گئی شام کی ٹیڑھی ہوا
پھول نے زیرِ زمیں اپنا بستر کر لیا

بستیوں میں کھڑکیاں شام سے رہتی ہیں بند
رخ ادھر کیوں تو نے اے ماہِ انور کر لیا

آنکھ اس کی مجھ پہ ہے وہم سا تھا ایک بار
اتنی سی اک بات کا دل نے دفتر کر لیا

بحر مدید مثمن سالم فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن دوبار

○

اب مجھ سے یہ رات طے نہ ہوگی
پتھر یہ جبیں نہ ہے نہ ہوگی

خورشید نہ ہو تو شہر دل میں
پرچھائیں سی کوئی شے نہ ہوگی

دروازہ کھٹک اٹھے گا اک بار
دستک کبھی پے بہ پے نہ ہوگی

آنکھوں میں لہو سنبھال رکھنا
اب کے مینا میں مے نہ ہوگی

خاک تھی آسماں جنابی سب
موت کی ہی تھی ہم رکابی سب

دل کی تفسیر پڑھ لوں آنکھوں میں
اور چہرہ لکھوں کتابی سب

خط میں بھیجوں اسے یہ بیت سراج
چشم و دل کی کہوں خرابی سب

"خون دل آنسوؤں میں صرف ہوا
گر گئی یہ بھری گلابی سب"[1]

چاندنی رات کی ہوائے سرد
لے گئی اس کی بے حجابی سب

داغ میں ہے گئے دنوں کی مہک
اڑ گئی گرچہ شوخ تابی سب

۱۔ یہ شعر سراج اورنگ آبادی کا ہے۔

امکان سے آگے کا جو منظر تھا ترا تھا
بند آنکھوں میں روشن وہ جو پیکر تھا ترا تھا

جن ہونٹوں کو چھونے سے بھریں زخم ترے تھے
جو حرف بہ صد رتبۂ گوہر تھا ترا تھا

برگشتہ ہوئے خواب جو مجھ سے تھے وہ تیرے
میں سات برس جاگ کے بے گھر تھا ترا تھا

اے تیرا بدن قصر شفق روے ہوا پر
میں نقش برآبی کا مقدر تھا ترا تھا

مرا یہ شعر بالآخر تجھے اپنی خبر دے گا
مرے سب ہمدموں کو بھی نوائے معتبر دے گا

بھلا اس جستجوے سائبان و در سے کیا حاصل
مجھے معلوم ہے مجھ کو وہ دوزخ ہی میں گھر دے گا

کئی لوگوں کو دیکھا ہے گریباں بھی نہیں رکھتے
کہ ننگے سینوں میں وہ چاندنی کے پھول بھر دے گا

گل امید کے دامن پہ چشم تر نے لکھا ہے
ہمیں تو کب سکوت آب سے آزاد کر دے گا

میں اتنا پوچھ لوں آنے میں اس کے دیر ہے کتنی
بھلا اتنی بھی فرصت تو مجھے اے رہگزر دے گا

سمندر میں لگائے گا کبھی یاقوت کی قلمیں
کبھی مٹی کی مورت کو چراغ بے بصر دے گا

مجھے سب کچھ سکھا کر کاٹ ڈالے گا زباں میری
نشانی میں وہ آنکھوں سے تکلم کا ہنر دے گا

حاصل نہ جس سے کچھ ہو ایسا سفر نہ دیکھا
ہو عافیت سے خالی ایسا بھی گھر نہ دیکھا

چاہت کے معرکے میں کچھ کارگر نہ دیکھا
تیشے کو کند پایا گردن پہ سر نہ دیکھا

آواز اس کی سننا تھا سحر پھول چننا
اک خواب ایسا دیکھا پھر عمر بھر نہ دیکھا

چاہت کے طرح کش ہو کچھ بھی اثر نہ دیکھا (میر)

اب ریت ہو چلی ہے پچھلے برس کی بارش
بادل نے راہ بدلی پھر گھوم کر نہ دیکھا

سب کشتیاں جلادیں سب نہریں خشک کردیں
دریا ہے دل نہ کشتی اے بے خبر نہ دیکھا

کیا زر نے سب کے دل میں سیسہ پلا دیا ہے
لاکھوں کا شہر کوئی شوریدہ سر نہ دیکھا

نقشِ پا دھندلی چمک دیکھ لوں آنکھیں رکھ دوں
برگِ یک خندہ نچوڑوں تو جگر تر کر لوں

سرخ ابلتا ہوا خوں سب کو بھلا لگتا ہے
جب چھری اپنے ہی دل پر ہو تو کیسے دیکھوں

توڑ کر لے لو مجھے شاخ پہ مرنے مت دو
نہ جسے دیکھیں تو گم ہو نئی خوشبو میں ہوں

سینہ چو رنگ اور اک گوشے میں مہتاب کی لو
صبح کاذب میں یہ دیکھا پہ بیاں کس سے کروں

نعت بطور غزل

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

دہ صد ملک نہ بیش زجان محمدؐ است
علم الیقین کم زگمان محمدؐ است

یک گوشۂ ولایت او دشت کائنات
بر ہر ورق کہ ہست نشان محمدؐ است

ایں سرخ و سبز بحر و بر و دشت و کوہسار
زیر نگین ہیچ کسان محمدؐ است

آں علم و فن کہ ارض و فلک را کند شکار
یک تیر بے خیال کمان محمدؐ است

دارم زبان لال و کنم مدح پادشاہ
ایں ہم دلیل ناطق شان محمدؐ است

میں نے یہ نعت ۱۹۷۰ میں کہی تھی۔ میرے والد مرحوم کو بہت پسند تھی۔ غالب کی زمین میں میرا کلام کیا، لیکن اسے والد مرحوم کی یاد کے طور پر شائع کر رہا ہوں۔ اب تک یہ غیر مطبوعہ رہی ہے۔

(عرفان صدیقی کے لئے)

○

بدل گئی ہے بہار و خزان دل زدگاں
نہ سنگ و گل نہ لہو ہے نشان دل زدگاں

اٹھی تھی قصر خرد سے جو احتساب کی لے
اڑا کے لے گئی آخر فغان دل زدگاں

زمیں تہی ہے جگر دار سے کہ ان کے گئے
کسی سے زہ نہ ہوئی پھر کمان دل زدگاں

ہو ذوق اگر تو یہ دیوار بھی سمجھ لے گی
کہ ترجمے سے ہے فارغ زبان دل زدگاں

تمام چہروں میں پنہاں اسی کا چہرہ تھا
مگر یقیں میں نہ بدلا گمان دل زدگاں

جو حشر کوہکن و قیس کا ہمارا بھی
کچھ ایسا عہد وفا ہے میان دل زدگاں

ہوس ہڑپ گئی بستر کی ان کو راتوں رات
رہا وہ عزم نہ وہ کاروان دل زدگاں

مرثیہ بطرزِ غزل، بہ یادِ زیب غوری

○

دگرگوں تھا کوئی دم میں یہ نقشہ دیکھ لینا تھا
تمھیں رنگِ رخِ اعدا کو اڑتا دیکھ لینا تھا

ابھی کتنوں سے لگ چلتی نہ جانے کتنے گھر کرتی
ذرا کچھ اور بھی دن رنگِ دنیا دیکھ لینا تھا

ابھی تو چشمِ زخمِ اخوانِ عالم تیز کرتے تھے
تمھیں سوئی کو چشمِ دل میں چبھتا دیکھ لینا تھا

تمھیں خاشاک صبح و شام کانٹے سا کھٹکتا تھا
کبھی تو خواب گلزار تمنا دیکھ لینا تھا

بہائی تھی دل شب تک جو اپنی جوے خوں اس کو
سر شاخ غزل سرسبز ہوتا دیکھ لینا تھا

مرے اے آسماں پرواز وقت شہپر افشانی
سواد آشیاں طوفان و دریا دیکھ لینا تھا

ایک فرمائش کی تکمیل ... بازی بارلیش بابا

شعلہ بہار رنگ ہے بھڑکی ہوئی ہے آگ
دل ہو نہ درد مند تو کس کام کی ہے آگ

اب کے دھوئیں میں خون کی سرخی کا رنگ ہے
یوں ان گھروں میں پہلے بھی لگتی رہی ہے آگ

شعلہ سرا ے دل سے ہے لالے کا روپ رنگ
شب کی فغاں سے خانہ بہ خانہ لگی ہے آگ

کیا عشق خانہ سوز کے دل میں چھپی ہے آگ (میر)

فرماں روائے شہر کی ہو اک نگاہ گرم
اس عشق خانہ زاد کے دل میں دبی ہے آگ

کیسے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے[1]
کیسے کہوں کہ تھی تو مگر بجھ گئی ہے آگ

[1] یہ مصرع غالب کا ہے۔

ابر بہاری اٹھا بھر گئی جیحون رنگ
سات سمندر ہوئے خوں سے مرے لالہ رنگ

خواب کا دیو سیاہ تنگ چھتوں کا ہراس
آنکھ کھلی تو بنا نقش گل ہفت رنگ

شیشۂ مہتاب اثر ہاتھ کی گرمی کا کھیل
دل بھی تو مجھ سے ملا اے گہر شام رنگ

بقید یک قافیہ

کالے گھنے پیڑ پر برف کا اجلا مکاں
تیرے نفس کی مہک گل سے بھی شاداب رنگ

چاہے وہ ہو ایک بار تاخت تو بھرپور ہو
جوہر جاں سرد کر خون کو کر خاک رنگ

صفحۂ خاک تھا میں سات سمندر وہ شخص
ایک بھی حرف نہ بولا مجھے پڑھ کر وہ شخص

آستیں شام کے رخسار پہ رکھ دی میں نے
پردۂ ماہ سے جھانکا کیا شب بھر وہ شخص

مقتل آراستہ تھا مجھ میں ہی ہمت کم تھی
تیغ دیدار تپاں رات کی چادر وہ شخص

ربط کا زہر گل زرد سا صحن دل میں
موت کی طرح سے اترا مرے اندر وہ شخص

○

اک لفظ وہ بھی بانجھ یہاں کس طرح بنے
پرچھائیوں سے کون و مکاں کس طرح بنے

ناخن سے سینہ چیر لوں کچھ کہہ نہ پاؤں میں
ناخن ہے تیز پھر بھی زباں کس طرح بنے

قالب میں پتھروں کے پڑی کس طرح سے جاں
اونچے مکان ریگ رواں کس طرح بنے

اس دل کے دشت شورہ پہ ٹکتا نہیں ہے کچھ
حیراں ہوں تیرے قصر یہاں کس طرح بنے

چہرے سے کس طرح اڑے یہ بے حسی کا رنگ
قلب و جگر کی آگ ـــ بیاں کس طرح بنے

تیرا مرا بھی ساتھ کوئی ساتھ تھا مگر
پانی سے دل پہ تیرے نشاں کس طرح بنے

شعلے میں تیرے شعلہ ملے جو بجھے وہ کیوں
دائم ہوس بہار خزاں کس طرح بنے

آگ نے دل کو دھو دیا آنکھ نے اشک پی لئے
لوگو چلو اٹھو کبھی اب حد سے زیادہ جی لئے

تیری سبھی سے گفتگو تجھ سے سبھی کی جستجو
پھر بھی ہے نقش آرزو رنگ شکستگی لئے

اپنے گھرانے کا نشاں ہے اک ادائے بے سری
ہم نے گلے پہ روک لی تیغ تری اسی لئے

جو اترا پھر نہ ابھرا کہہ رہا ہے
یہ پانی مدتوں سے بہہ رہا ہے

مرے اندر ہوس کے پتھروں کو
کوئی دیوانہ کب سے سہہ رہا ہے

تکلف کے کئی پردے تھے پھر بھی
مرا تیرا سخن بے تہہ رہا ہے

کسی کے اعتماد جان و دل کا
محل درجہ بہ درجہ ڈھہ رہا ہے

گھروندے پر بدن کے پھولنا کیا
کرائے پر تو اس میں رہ رہا ہے

کبھی چپ تو کبھی محو فغاں دل
غرض اک گومگو میں یہ رہا ہے

ادھر سے دیکھیں تو اپنا مکان لگتا ہے
اک اور زاویئے سے آسمان لگتا ہے

جو تم ہو پاس تو کہتا ہے مجھ کو چیر کے پھینک
وہ دل جو وقت دعا بے زبان لگتا ہے

شروع عشق میں سب زلف و خط سے ڈرتے ہیں
اخیر عمر میں ان ہی میں دھیان لگتا ہے

سرکنے لگتی ہے تب ہی قدم تلے سے زمیں
جب اپنے ہاتھ میں سارا جہان لگتا ہے

دو چار گھاٹیاں اک دشت کچھ ندی نالے
بس اس کے بعد ہمارا مکان لگتا ہے

اس لو کی چمک دل سے بسرنی تو نہیں تھی
درہم تھی بساط اپنی بکھرنی تو نہیں تھی

تا عمر جو روزے رکھے حاصل ہوا کیا خاک
چٹخارے کی خواہش کبھی مرنی تو نہیں تھی

خم خانے کے در پر میں سوالی بھی جو ہوتا
ترخی ہوئی ٹھلیا مری بھرنی تو نہیں تھی

تھا جرم ضعیفی تو سزا طول شب و روز
جیسی مجھے بھرنی پڑی کرنی تو نہیں تھی

اچھا ہے کہ ہے جلد بدن کانٹوں سے مانوس
مجھ سے یہ قبا ورنہ اترنی تو نہیں تھی

مجبور ہوا وقت کی تنگی سے میں ورنہ
یہ آخری بازی یوں ہی ہرنی تو نہیں تھی

بے صرفہ و بے شہرہ سہی عمر ہماری
ناجنسوں میں یوں کٹ کے گزرنی تو نہیں تھی

جب ساتھ چھٹا مجھے دور سفید گھروں پہ دھواں سا دکھائی دیا
جب ہوش ہوا تو نہ جسم نہ جاں اک زرد مکاں سا دکھائی دیا

کبھی شام کے رنگ سا ہوش ربا مرے منہ میں کسی کی زباں کا مزا
کبھی سر میں شکستگی رگ قوس قزح کا سماں سا دکھائی دیا

کوئی خوشبوے صد لب نغمہ نما مرے کام و دہن کو ترستی رہی
اک پھول سا لہجہ تھا جو دل میں اتر کے فغاں سا دکھائی دیا

تھی ایک ہی بات جو میں نے سو سو طرح سے سو سو بار کہی
بے برگ شجر اظہار تھا میرا ننگ بیاں سا دکھائی دیا

جو سچی بات بھی میں نے کہی وہ جھوٹ بنی مٹی میں ملی
جو آنکھ نے دیکھا اصلی تھا نیرنگ جہاں سا دکھائی دیا

○

مرا جسم آشوب جانی ہوا
شرر بے مکاں تھا مکانی ہوا

شجر شاخ پھر بھی نہ شعلوں کھلی
جگر سنگ جل جل کے پانی ہوا

جو کاغذ پہ لکھا تو جھوٹا لگا
وہ سب کچھ جو ہم میں زبانی ہوا

ترے اسمِ سامی سے ٹھنڈک تمام
ترا ذکر موج و روانی ہوا

مری جنگ تنہا ادھوری رہی
مقابل مراجب سے ثانی ہوا

○

ٹھنڈی ہوا میں پھیلی وہ خوشبو گریز پا
سارا تھا پچھلی رات کا جادو گریز پا

بے حد و بے خیال مسافت کے آسمان
تجھ میں مرا وہ اخترِ خوش خو گریز پا

تجھ ربط بے کنار کا اٹھتا نہیں ہے بوجھ
آنکھیں دھواں ہیں قوت بازو گریز پا

اب دل سے دھل گیا ہے وہ نقش ہزار رنگ
اس دشت میں تھی رونق آہو گریز پا

ڈوب کر آنکھوں میں تیری بے کراں تک گھومتا
جسم سے اپنے نکل کر آسماں تک گھومتا

خار ہوں میں اے گلِ خوبی تو ہے جنت کا پھول
دل میں تیرے چبھ کے میں بھی دو جہاں تک گھومتا

دھیرے دھیرے کھڑکیوں پر جم گیا میرا غبار
یک جہاں آشفتہ تھا پھر بھی کہاں تک گھومتا

(نیر مسعود کے لئے)

○

ہے یوں تو قلعۂ دیروز کا نشاں محراب
ہے فاختہ کو مگر کنج آشیاں محراب

قدم ٹھہرتے نہیں قصر پست و بالا میں
زمیں ہے فرش تو ہے قوس آسماں محراب

دو دھاری تیغ کا دامن مرا مصلیٰ ہے
بنی ہے سر پہ مرے ظلم کی کماں محراب

دل بنائے منہدم بنائے نہیں بنتی بنائے
کدھر ستوں ہے کہاں کرسی اور کہاں محراب

یہ دیکھیں سجدہ کرے کب رکوع سے اٹھ کر
بدن کی مٹی ہے بھاری بنی ہے جاں محراب

○

خود تو میں جھوٹا ہوں جھوٹی پھر یہ دنیا کیوں نہیں
رات جب سوتا ہوں میں عالم یہ سوتا کیوں نہیں

میرے منھ پر تو ہوس کی اک علامت تک نہ تھی
وہ جھجک کر ہٹ گئی کچھ مجھ سے پوچھا کیوں نہیں

یہ شکستہ نیم جاں سا خواہشوں کا سائباں
اس میں جو رہتا ہے وہ کم بخت مرتا کیوں نہیں

شب کی گہرائی میں اڑتا شاہباز بے نیاز
اشتیاق صید میں مجھ پر اترتا کیوں نہیں

بس کہ سجدے کے جتن شیخ حرم نے نہ کئے
اپنے اسرار عیاں اس پہ صنم نے نہ کئے

حرمت اہل دول سجدۂ بت مدح رقیب
کام کرنے کے بہت تھے کہ جو ہم نے نہ کئے

سینہ صد چاک کیا قلب کو چو رنگ کیا
حیلے کیا کیا ہوس سیر عدم نے نہ کئے

بھر دیا ایک توجہ سے ہوس کا کشکول
حصے جلووں کے ترے مہر کرم نے نہ کئے

سرخ رو ہیں کہ ملے منھ پہ لہو کے قطرے
رگ جاں سے جو قبول اس کے قدم نے نہ کئے

کاغذ قلم ہیں سامنے لکھنا گیا ہوں بھول
دامن میں جوشِ اشک سے ڈھیروں پڑا ہے پھول

بچپن کے ساتھ چھوڑ کے ہم جولیوں کو بھی
تنہا ہو تم اگر تو ہو بے بات ہی ملول

میں پاپیادہ خواب کے رستے پہ ہوں رواں
یہ راہ قطع ہو تو ملے گوشۂ خمول

دنیا کا بادشاہ بھی ہے کیا ستم ظریف
لے ہم سے کام پھر کہے یہ کام تھا فضول

چوری بھی لوٹ مار بھی دریوزگی بھی کی
لفظوں کی مملکت میں نہ کچھ بھی ہوا حصول

ہے تجھ سے جتنا سکھ مجھے اتنا ہی دکھ بھی ہے
پھولوں میں تو گلاب ہے کانٹوں میں تو ببول

کپڑے نئے پہن کے میں اس بزم میں گیا
دامن سے پھر بھی لگ گئی بدنامیوں کی دھول

گلشن میں تم کدھر سوں پیارے پڑے ہو بھول (شاہ حاتم)

چپکے سے ڈھک لے جسم کو پیکر وہ برگ ہے
سبزی سے جس کی خاک ہو منظر وہ برگ ہے

وہ گل ہے جو ہے آگ کے اندر کھلا ہوا
تنہا لرز رہا ہے جو بے گھر وہ برگ ہے

تارا زمیں کی آنکھ کا ہے آسماں کی بیل
ٹوٹا ہے میرے سر پہ جو پتھر وہ برگ ہے

دھبا نحیف سا وہ پہاڑوں کی اوٹ میں
بال ہما نہیں ہے سراسر وہ برگ ہے

بجھنے سے پہلے چشم بہاری بھی دیکھ لے
خیمہ ادھر ہے پھول کا چادر وہ برگ ہے

○

بازو بل کھاتے سانپوں کا کون ہے جو سپیرا ہو[1]
دیکھ لوں جھک کے آنکھوں میں زہر بھی ہو تو میرا ہو

برگ آواز میں لپٹا غنچۂ عریاں بدن تیرا
دمبدم مجھ میں چمکے گا چاہے جتنا اندھیرا ہو

---

[1] وزن خود ساختہ : فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن

جھوٹے چمکیلے کاغذ کے قریۂ سر بریدہ کو
آگ ہم نے دکھا دی ہے دیکھیں کب تک سویرا ہو

شام نارنج دریا میں مچھلیاں روشنی کی ہوں
گرم دم سادھے سناٹا یکہ تنہا مچھیرا ہو

○

دعا کرنا نہیں کہنا نہیں ہے
مگر یہ ظلم بھی سہنا نہیں ہے

چھری ہم مار بھی لیں گے بغل میں
ہمیشہ سوچتے رہنا نہیں ہے

میں دریا ہوں مگر کوزے میں ہوں بند
مری تقدیر میں بہنا نہیں ہے

یہ سازِ دل ہے بے آواز بہتر
کسی بارات کی شہنا نہیں ہے

بنائیں گے نئی دنیا ہم اپنی
تری دنیا میں اب رہنا نہیں ہے

چمک چہرے کی تیرے کم نہ ہوگی
کرن خورشید کا گہنا نہیں ہے

○

بس ایک رشتہ ہے جس میں پرو گئی ہو گی
وہ اشک خواب سے چہروں کو دھو گئی ہو گی

جو چشمہ زیر زمیں ہے وہ تھاہ کیا جانے
وہ غوطہ خور پری کب کی کھو گئی ہو گی

صدائے آب روانی کسی سے دبتی ہے
مری بھی گرمیٔ حرف اس میں کھو گئی ہو گی

وہ موج موج دل ساحل غریبی کو
جو کچھ نہیں تو لبوں تک بھگو گئی ہوگی

سیاہ لفظ کے جنگل میں راستہ ہے نہ سمت
وہ انتظار میں رو رو کے سو گئی ہوگی

ہجر کی آگ میں بھنتا ہوں
لہجہ تیرا سنتا ہوں

شجر تناور اوپر سے
اندر اندر گھنتا ہوں

اشک تو بہتا ایک نہیں
جھوٹے موتی چنتا ہوں

دل کے کنوئیں میں گرتے ہیں
سات سمندر سنتا ہوں

پچھتاوے کی لکڑی سے
اپنے جگر کو دھنتا ہوں

وہم و خیال سے نازک تر
تانے بانے بنتا ہوں

ذرا سا تجھ سا بن جاؤں
سیکڑوں طرحیں گنتا ہوں

گننا (بروزن چننا) = مشق کرنا

○

وہ جوئے تنک آب سکھا دی گئی شاید
وہ خون کی اک بوند گنوا دی گئی شاید

جس شمع کی لو پر میں کھنچا آیا تھا کل رات
وہ آج خدا جانے بجھا دی گئی شاید

میں خاک مہ و سال میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں
مٹی کی کمائی تھی مٹا دی گئی شاید

اب تو فقط اشراف ہیں میں دیر سے پہنچا
رسوائی کی پھلواری لٹا دی گئی شاید

جو بھوک سے بے تاب تھی وہ گربۂ مسکیں
کچھ کھیر چٹا کر کے سلا دی گئی شاید

تھا خوف تمام اہل محلہ کو اسی کا
وہ بیچ کی دیوار اٹھا دی گئی شاید

یوں مجھ میں اور اس میں تو مراعات بہت تھی
لیکن مرے مرنے پہ بڑھا دی گئی شاید

کھلا کر گل تر بنایا مجھے
خزاں سے نہ کیوں پھر بچایا مجھے

بتا میرے سینے پہ کیا مہر تھی
کہ پیغام تیرا نہ آیا مجھے

تری پیاس شبنم سے بجھتی نہیں
تو بے وجہ کیوں یوں رلایا مجھے

فراز صلیبی تو اک سال تھا
برس کے برس پھر گھٹایا مجھے

○

سو بھیس میں میں آیا بولا ہی نہیں کوئی
اب مر کے پھر اٹھوں تو چولا ہی نہیں کوئی

ایوان حکومت میں اشعار پڑھے اس نے
کرسی سے مگر اپنی ڈولا ہی نہیں کوئی

ہیجان سا کیسا ہے خوں میں مرے میں نے تو
دروازہ ابھی دل کا کھولا ہی نہیں کوئی

محفوظ نہ جانو تم خود کو کہ ہنر اس نے
شمشیر کی میزاں میں تولا ہی نہیں کوئی

جب اجنبی رات آئی سارے کا وہ سارا گھر
سہما ہوا ایسا تھا بولا ہی نہیں کوئی

اک لفظ تو کہہ دیتا اس نے مرے کانوں میں
کڑوا ہی نہ میٹھا رس گھولا ہی نہیں کوئی

خالی گلی ہے جو رنہاں اس کا کیا بتاؤں
آبادیوں میں گم ہوں نشاں اس کا کیا بتاؤں

سارے بدن میں دھوپ سی اظہار کی چمک
وہ خوش لباس عجز بیاں اس کا کیا بتاؤں

آرائشوں سے پاک وہ عریاں زمیں کی طرح
شانے کے بل خیال وگماں اس کا کیا بتاؤں

جو خواب سے نکل کے اچانک ملا مجھے
وہ خون میں لکھا تھا نشاں اس کا کیا بتاؤں

ہے بے شمار زرد خموشی میں کائنات
بے حرف و لفظ درد زیاں اس کا کیا بتاؤں

اب جسم و جاں میں سانپ سی لہرا رہی ہے موت
بجلی کا رنگ خوں میں رواں اس کا کیا بتاؤں

سوار ابلق لیل و نہار دیکھوں گا
میں آنکھیں چیر کے پردے کے پار دیکھوں گا

ہے پھول کھلنے کو اور خار ہجر تا بہ جگر
میں بچ گیا تو سحر کو بہار دیکھوں گا

ہوا رکے مرے پاؤں ذرا تھمیں اک روز
میں آستان و در و کوے یار دیکھوں گا

تمام عمر کی مہجوری گھر پہ برسے گی
میں جنگلوں میں ترا انتظار دیکھوں گا

کشاں کشاں میں چلا ہوں کہ شہر خوشبو کو
نکل کے دشت سے دریا کے پار دیکھوں گا

میں پا شکستۂ شب بے دلی کے صحرا میں
پری کے سینے پہ کانٹوں کا ہار دیکھوں گا

○

وحشت نے کر دیا ہے تمھیں کیا سے کیا میاں
دامن ٹکا ہے دامن صحرا سے کیا میاں

کم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اس سے کم
بندوں کو تیرے چشم تماشا سے کیا میاں

مٹی ہے جب سیاہ تو اترے گا کیسے نور
زنگی ہوس کے دل کو سویدا سے کیا میاں

دیکھیں جو دور سے تو ہیں آب و سراب ایک
زندان تشنگی کو ہے دریا سے کیا میاں

پانی کے رنگ سوکھ گیا سب بدن کا خوں
گذرے ہو تم بھی شوق کے صحرا سے کیا میاں

ہیں موت سے بھی بڑھ کے جنھیں آج کے سوال
ان کو جواب نامۂ فردا سے کیا میاں

اجی بس عشق کا اتنا ہے مبحث
کہ معشوق اک دو عاشق اک مثلث

طلب بوسے کی کرنا جاں نہ دینا
ہے بدعت اور ہر بدعت ہے محدث

جو فالاتن بنے گا فاعلاتن
تو کہلائے گا وہ رکن مشعث

نہ ہو قحط الرجال اس شہر میں کیوں
مذکر بن گئے ہیں سب مونث

کچھ ایسے غوطے بحرِ شعر میں کھائے
مضارع کو سمجھ بیٹھے وہ مجتث

ہے جن لوگوں پہ اب مردانگی ختم
ہمارے تو حسابوں ہیں مخنث

یہاں جنت میں ہوتے شیخ جی بھی
تصنع میں نہ ہوتے جو ملوث

بہ کویش رہ سپاری اے دل اے دل مرا تنہا گذاری اے دل اے دل

(نورالعین واقف)

تو جا کر رہ گیا اس کی گلی میں اے دل اے دل
مجھے چھوڑا ہے کس کی دوستی میں اے دل اے دل

لکھے جاتا ہے فرد شوق کے دفتر پہ دفتر
تجھے ملتا ہے کیا اس نوکری میں اے دل اے دل

اندھیرے گھر سے نکلوں بھی تو کیا حاصل بھلا تو
اسے پہچان لے گا روشنی میں اے دل اے دل

میں تیرے ساتھ چلتا ہوں جو تو کہہ دے نہیں ہے
ضرر خس کو شرر کی ہمرہی میں اے دل اے دل

پری زادوں میں چپ رہیو نہ ایسا ہو کہیں وہ
نہیں کچھ ظرف مرد آدمی میں اے دل اے دل

نہ بونا یار کے دامن میں گوہر اشک دانہ
کہ اگتا ہی نہیں کچھ اس زمی میں اے دل اے دل

مگر کو شیر نے جس جا پچھاڑ باندھ دیا
وہیں پہ تم نے ہرن کر کے آڑ باندھ دیا

ہوائے لذت دنیا سے گل ضمیر کی لو
حسد کی آگ نے سینوں پہ بھاڑ باندھ دیا

بجا ہے قول میاں مصحفی کا ہم نے عبث
حکیم وید سیانوں کا جھاڑ باندھ دیا

"بھلا درستی اعضائے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا"[1]

---

[1] یہ شعر مصحفی کا ہے۔

علاج اب ہو بھلا کیا دل شکستہ کا
کہ ساٹھویں نے بدن پر بگاڑ باندھ دیا

لگاتے کیوں نہ پھریں چوکڑی ادیب الملک
حمق نے پاؤں میں ان کے ہے تاڑ باندھ دیا

ہوس کے باغ کو سبز اتنا کس لئے رکھا
مرے چمن کو تو ظالم اجاڑ باندھ دیا

امید دید میں آیا تھا میں مگر اس نے
اٹھا کے کاندھے پہ میرے کباڑ باندھ دیا

جدائی میں ترا عہد وفا ہے یوں جیسے
کسی نے پیٹھ پہ میری پہاڑ باندھ دیا

مورنامہ اور دوسری نظمیں

طٰسین، ساحل،
نیسان اور تضمین آمنہ
کے لئے

مورنامہ

اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں

دن بھر موروں کی جھنکار
اوپر نیچے چیخ پکار
شیر میاں کو نیند نہ آئی
لے کر اک لمبی سی جمائی

لومڑی بی سے کہلایا
موروں کو کس نے بلوایا؟
مور تو کرتے شور بہت ہیں

اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں

رات کا آنگن چاندی جیسا
دن کا چہرہ تھالی جیسا
رات کے گھر میں کتنے گھوڑے
دن کے کپڑے کتنے جوڑے
مور کے کپڑے کیسے انوکھے
نیلے ہرے سے سرخ سنہرے
مور کی دم میں سونے کے چھلے
اس سے کہنا ہم سے بدل لے

بھورے سنہرے پروں کو کھولے
مور اڑا تو سب یہ بولے
اس کے پر کمزور بہت ہیں

اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے چور بہت ہیں

شینوکی سیامی بلی کا سراپا

بلی اجلی مونچھوں والی
کچھ کچھ بھوری کچھ کچھ کالی

آنکھ مگر اس کی نیلی ہے
تیز نہایت چمکیلی ہے

کان بھی کالے منہ بھی کالا
آخر وہ ہے شیر کی خالہ

پنجے ہیں کالی کوئل کے رنگ
دل کو لبھاتے ہیں اس کے ڈھنگ

ہلکا سفید ہے اس کا ماتھا
پیٹھ کا رنگ ہے گاڑھا بھورا

سب میں انوکھی پھر بھی دم ہے
بھوری کالی موٹی دم ہے

چال میں ہے وہ پی۔ٹی۔اوشا
حال ہے اس کا ہم تم جیسا

کھیلنا کھانا کام ہے اس کا
سیمیں سن لو نام ہے اس کا

تم کا مطلب ہم

اک چوہا اک چوہیا
اک بلا اک بلی
اک کتا اک کتیا
اک گھوڑا اک گاڑی
اک تھالی اک بینگن
اک آلو اک شلغم
اک چوڑی اک کنگن
اک چھکڑا اک ٹم ٹم
اک ہاتھی اک ہتھنی
اک کرتا اک ساری

اک بُندا اک نتھنی
اک انجن اک لاری
سب نے مل کر دوڑ لگائی

سب سے پہلے پہنچے تم
تم کا مطلب یعنی ہم
دوڑ دھما دھم دوڑ دھما دھم

اک گلاس پانی میں

اک گلاس پانی میں
تین ننھے مینڈک تھے

یہ نہ پوچھیے صاحب
وہ کہاں سے آتے تھے
کیوں گلاس میں ان کو
گھر ملا تھا رہنے کو

" واہ وا۔ گلاسوں سے
مینڈکوں کو کیا لینا ؟
ہاں کنول کے تالابوں

حوض اور باغوں میں
جھیل اور چشموں میں
ننھے منے مینڈک اور
ان کے باپ ماں ماموں
اور سارے گھر والے
ہم نے رہتے دیکھے ہیں

"کیا پتہ سمندر میں
یا کسی کنویں میں بھی
چھپ چھپا کے رہتے ہوں
کودتے اچھلتے ہوں
ہاں مگر گلاسوں میں
کب کسی نے مینڈک کو
رہتے سہتے دیکھا ہے؟
یہ سوال تو صاحب
ہم ضرور پوچھیں گے
اک گلاس پانی اور

تین تین ۔ ۔ ۔ اونہہ ہوں ہوں
اس میں کوئی گڑبڑ ہے۔"

سن تو لیجیے صاحب
صبر کیجیے صاحب
اس میں کچھ نہیں گڑبڑ
آپ کیوں کریں ہڑبڑ

ایک تھے میاں طٰسین
ایک ان کی خالہ بی
گھر میں باغ تھا ان کے
باغ میں کنول تالاب
صبح کو کنول سارے
کھلکھلا کے ہنستے تھے
دن میں دھوپ کے مارے
چپ چاپ رہتے تھے
سردیوں کی راتوں میں

چاند کی کرن پی کر
سارے پھول سوتے تھے
گرمیوں کی شاموں میں
ٹھنڈی اوس کھا کھا کر
خوب مست ہوتے تھے

ایک دن کا قصہ ہے
قصہ پورا سچا ہے
اور امی کا طشین
سب سے اچھا بچہ ہے
باغ میں کئی مینڈک
گھومنے کو آ نکلے
باغ، حوض کی ٹھنڈک
دیکھ کر کے سب مینڈک
بولے گھر یہ اچھا ہے
تھوڑا تھوڑا پکا ہے
تھوڑا تھوڑا کچا ہے

ہم یہیں رہیں گے اب
حوض میں بہیں گے سب
گھاس پتی کھائیں گے
خوب موج اڑائیں گے۔

چھپ چھپاک چھپ چھپ چھپ
چھپ چھپاک چھپ چھپ چھپ
اٹھیں لہریں پانی میں
موج کی روانی میں
مینڈکوں نے گھر ڈھونڈا
آئی حوض میں ہلچل
دل بھی لگ گیا سب کا
کوئی تخت پر بیٹھا
رہ گیا کوئی پیدل

شام کو ہوا ایسا
مینڈکوں کا ترانا

بار بار چلانا
دھوم دھام سے گانا
سن کے خالہ بی بولیں
"امتحان ہے سر پر
پاس امتحاں کر کے
ڈاکٹر بنوں گی میں
لیکن اب پڑھوں کیسے
باغ میں جو مینڈک ہیں
اتنا شور کرتے ہیں
لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں
روز روز بڑھتے ہیں
مجھ کو کام کرنا ہے
پڑھنے یہ نہیں دیتے
سونے یہ نہیں دیتے
کل میں چاقو لاؤں گی
خوب تیز پتلا سا
مینڈکوں کو ماروں گی

حوض سے نکالوں گی
کل کلاس میں مجھ کو
چیر پھاڑ کرنا ہے
بس انھیں کو کاٹوں گی
جاں سے سب کو ماروں گی"

یہ تو تھا مگر طلسین
دور بیٹھے سنتے تھے
اپنے دل میں ڈرتے تھے
مینڈکوں کو خالہ بی
کاٹ پیٹ ڈالیں گی
بات یہ نہیں اچھی
ان کو میں بچا لوں گا
جیب میں چھپا لوں گا

چپکے سے میاں طلسین
اک گلاس چھوٹا سا

لے کے باغ میں آئے
جھک کے حوض میں لمبے
چاہا پکڑیں مینڈک کو
پھر کہیں چھپا لیں گے
خالہ بی کے چاقو سے
ان کا سر بچا لیں گے

اور کچھ نہ ہاتھ آیا
تین بچے مینڈک کے
اس گلاس میں لیکن
کودتے ہوئے آئے
سمجھے یہ نیا گھر ہے
اب اسی میں رہنا ہے
کیا ہوا جو چھوٹا ہے
ہم میں کون موٹا ہے
سب ہی دبلے پتلے ہیں
موٹے ہیں نہ لمبے ہیں

ہم مزے سے رہ لیں گے
گھر بہت ہی اچھا ہے
سر پہ چھت نہیں تو کیا
کھڑکیاں ہیں شیشے کی
خوب دھوپ آتی ہے
رات بھی اندھیرے میں
جھومتی ہے گاتی ہے

اب مگر میاں طلین
تھک گئے تھے بے چارے
اک جماہی گہری سی
لی انھوں نے اس کے بعد
ہو کے گھاس پر لمبے
سو گئے شرافت سے

گہری نیند خراٹا
خر خرر خرر خر خر